# کاغذ کی ناؤ

(ناول)

کرشن چندر

کراچی بک ڈپو

۴۰۔ اردو بازار۔ کراچی

قیمت

اُردو لائبریری میں پہلی مرتبہ

نومبر ۱۹۶۶ء

ناشر

کراچی بک ڈپو

۴۸- اردو بازار کراچی

کتابت

یوسف۔ آصف

مطبوعہ

جاوید پریس کراچی

# ابتدائیہ

میں آٹھ نومبر ۱۹۴۸ عیسوی میں پیدا ہوا۔ میری جائے پیدائش ناسک ہے۔ لیکن مجھے اپنے وطن میں رہنے کا بہت کم موقع ملا ہے۔ میں ایک آوارہ گرد ویلانی ہوں۔ گاؤں گاؤں شہر شہر گھومتا ہوں اور سدا چکر میں رہتا ہوں۔

جہاں جاتا ہوں لوگ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور خندہ پیشانی سے میرا استقبال کرتے ہیں۔ اس دنیا میں کوئی میرا دشمن نہیں ہے۔ سب میرے دوست ہیں۔ سب مجھے دل وجان سے پیار کرتے ہیں۔

میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ سیکھا ہے۔ کھویا ہے۔ لیکن اپنی زندگی کے مختلف تجربوں کے باوجود ایک بات میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں۔ کہ اپنی چھوٹی سی زندگی میں میں نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ آج تک کسی بڑے سے بڑے سیاسی نیتا مصلح اعظم۔ یا فلم اسٹار کو بھی وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی جو مجھے حاصل ہوئی ہے۔ ہندوستان کا بچہ بچہ مجھے جانتا ہے۔ اور عزت کرتا ہے۔

میں دس روپے کا نوٹ ہوں۔

# پہلا باب

تلسی بائی کے ہونٹ خوف سے پیلے پڑ گئے تھے۔ اُس کی آواز میں سوکھے پتوں کی لرزش تھی۔ اور یہ سوچ سوچ کر اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا کہ اگر عائشہ بی نے بھی انکار کر دیا تو پھر وہ کیا کرے گی؟ کس کے پاس جائے گی۔؟ اس لئے تلسی بائی نے ہاتھ جوڑ کر۔ گڑگڑاتے ہوئے عائشہ بی سے کہا۔

"بائی میری تائی دس (۱۰) روز سے بیمار ہے۔ اسکا بخار ٹوٹتا ہی نہیں۔ دس روپئے ادھار دیدو۔ پگار میں سے کاٹ لینا۔"

عائشہ نے ناں تو نہیں کی، پر بولی۔ . . . "تیری پگار اکیس (۲۱) روپئے ہے نا؟ تو مجھ سے دو روپئے ادھار لے چکی ہے اب تک (۱) ای جھینے ہیں۔ ہے نا؟"

تلسی نے سر ہلا کر ہاں کہا۔

"اچھا اب دس روپئے اور لے گی۔ تو ہو جائیں گے انیس (۱۹)۔ ٹھیک؟"

عائشہ نے پوچھا۔

"ٹھیک !" تلسی نے بڑھتی ہوئی مایوسی سے کہا

"تو گویا مہینہ ختم ہونے کے بعد تجھے اکیس کے بجائے صرف دو روپے ملیں گے۔ کیونکہ تو انیس لے چکی ہو گی۔ اب اچھی طرح سے سوچ لے اور پھر ادھار مانگ !"

تلسی بائی نے سوچا۔ مجھے آج اپنی بیٹی کے علاج کے لئے روپوں کی ضرورت ہے۔ مہینہ ختم ہونے کے بعد پھر ضرورت ہوگی۔ تب میں کیا کروں گی ؟ میں نہیں جانتی۔ آگے بھی اندھیرا ہے۔ اس وقت بھی اندھیرا ہے۔ پر یہ مصیبت کا سمے تو ٹل جائے میری بیٹی کسی طرح اچھی ہو جائے۔ آگے میں دیکھ لوں گی۔ مگر آگے بھی کیا دیکھ لوں گی ؟ عائشہ بی ٹھیک تو کہتی ہیں۔ مگر ٹھیک کہنے سے کیا یہ مصیبت ٹل سکتی ہے۔ دس روپئے تو لینے ہوں گے ادھار، اور اگلے ماہ بھر دینے ہوں گے۔ اسلئے آج کی مصیبت اور آنے والی مصیبت دونوں کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے تلسی نے پھر بڑی عاجزی سے کہا۔

"تو مالکن تھوڑا تھوڑا کر کے پانچ مہینوں میں کاٹ لینا۔" تلسی نے گھبرا کر کہا وہ محنت کرنے والی خود دار عورت تھی۔ اس طرح مانگنے سے اُسے شرم بھی آ رہی تھی۔ اپنے آپ پہ غصہ بھی۔ عائشہ پہ بھی اُسے غصہ آ رہا تھا۔ وہ سمجھتی کیوں نہیں کہ اسکی ضرورت کیا ہے ؟ بھلا عائشہ کے بٹوے میں ہمیشہ نوٹ بھرے کیوں رہتے ہیں ؟ اور دن رات

کام کرنے کے بعد بھی تلسی کی جیب خالی کیوں رہتی ہے ؟ ارے مانگنا کتنا مشکل کام ہے۔ جی چاہتا ہے کسی کا گلا گھونٹ دوں۔ مگر اپنے غصے کو دباتے دباتے تلسی بائی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ گھٹے ہوئے غم اور غصے کے تلخ آنسو تھے انہیں دیکھ کر عائشہ کا دل پگھلنے لگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بائی اچھی عورت ہے روز روز تو مانگتی نہیں ضرور اس کی بیٹی بیمار ہوگی۔ یہ بہانے کر کے ادھار لے جانے والی عورت نہیں ہے۔ ویسے آجکل دنیا میں کسی کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ کب سچ بول رہا ہے کوئی ؟ کب جھوٹ ؟ دس روپئے دیدینے میں کیا ہرج ہے ؟ تین مہینوں میں کاٹ لوں گی۔

"تلسی بائی ہاتھ جوڑے مجبور لہجے میں کہہ رہی تھی" میں نہ مانگتی۔ مگر میرا گھر والا کیسا ہے تم جانتی ہو۔ تین دن سے کام پر نہیں گیا۔ شراب پی کر دھت پڑا ہے۔ جاگتا ہے تو اور شراب مانگتا ہے۔ یا مستی میں آ کر مجھے پیٹنے لگتا ہے۔ یہ دیکھو۔!"

تلسی بائی اپنے جسم کے نیل دکھانے لگی "اب اُسے کیا کہوں ؟" تلسی بائی نے اپنی ساڑی کے پلّو کے ایک چھوٹے سے کونے سے اپنے آنسو پونچھے۔

عائشہ نے اپنے بٹوے میں ہاتھ ڈال کر "بجھے" نکالا، اور تلسی بائی کے حوالے کرتے ہوئے کہا "لو یہ دس روپے۔ تین مہینے میں کاٹ لوں گی"

"اچھا" کہہ کر تلسی بائی "بجھے" وہاں سے لیکر بھاگی۔ وہ گھر سے نکل کر باہر سڑک پر آ گئی "بجھے" غور سے دیکھا جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ کانپتی ہوئی

انگلیاں 'مجھے' ٹٹول رہی تھیں۔ جیسے ماں پیار سے اپنے کا جسم ٹٹولتی ہے۔ پھر اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اپنے ماتھے سے لگا لیا جیسے میں "دس" کا نوٹ نہیں ہوں۔ تانی کی زندگی ہوں۔ تلسی کی ممتا کی آخری امید ہوں پھر وہ سڑک پار کر کے سامنے کے جھونپڑوں کی طرف دوڑنے لگی۔ کیونکہ دوا کا نسخہ تانی کے بستر کے نیچے پڑا تھا۔ اس کا جھونپڑا چھ فٹ لمبا، پانچ فٹ چوڑا، چار فٹ اونچا تھا۔ اس میں بہت جھک کر داخل ہونا پڑتا تھا۔ داخل ہونے سے پہلے تلسی نے 'مجھے' تہہ کر کے اپنی چولی میں چھپا لیا۔ اور گھٹنوں کے بل ہو کر وہ اپنے جھونپڑے میں داخل ہوئی۔ اس کا گھر والا گھڑے سے پانی نکال کر مٹی کے ایک کوزے میں پانی پی رہا تھا۔ ایک کونے میں تانی بخار سے پھنک رہی تھی۔ تلسی نے گھبرا کر اپنی بیٹی کے ہنڈے کو ہاتھ لگایا۔ پھر فوراً ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ آگ کی طرح تپ رہی تھی تانی اور آنکھیں اوپر کو چڑھ گئی تھیں۔ گھبرا کر اس نے اپنے سینے پر دو ہتڑ مارے۔ بولی۔

"تین دن سے شراب میں دھت پڑے ہو اور لڑکی کا یہ حال ہو گیا ہے۔ مگر تمہیں گھر کی فکر ہی نہیں ہے کھاکرے۔"

کھاکرے نے مٹی کا کوزہ گھڑے پر اٹھا کر رکھ دیا گھٹنوں کے بل چلتا ہوا۔ لڑکی کے پاس آیا۔ اس کے سر اور ہنڈے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شرمندگی کا ایک عجیب سا احساس تھا۔ نرمی سے بولا۔

"ٹھیکیدار سے جا کر ایڈوانس مانگتا ہوں۔"

"ٹھیکیدار سے جا کر ایڈوانس مانگتا ہوں۔" تلسی کھاکرے کا منہ چڑاتے ہوئے بولی۔ "تیس روپے پہلے سے ایڈوانس لے چکے ہو۔ اب وہ تمہیں کیوں دے گا۔؟ تم بیٹھو یہیں۔ لڑکی کو دیکھو۔ میں کہیں نہ کہیں سے بندوبست کر کے دوا لاتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر تلسی نے تانی کے بستر کے نیچے سے دوا کا نسخہ نکالا۔ کھاکرے نے تلسی کو شبہے کی نظروں سے دیکھا۔ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا تلسی کے پاس آیا۔ بولا۔

"بندوبست کر لیا ہے؟ یا کرنے جا رہی ہو؟"

"کہاں سے کیا ہے؟" تلسی کچھ گھبرا کر کچھ خفا ہو کر بولی۔ "تین گھروں میں برتن جھاڑو کا کام کرتی ہوں۔ کسی نہ کسی کے دل میں تو دیا آ جائے گی۔ رو پیٹ کر دس روپے تو مل ہی جائیں گے۔"

"مل جائیں گے نہیں۔ تم دس روپے لے کر آئی ہو۔" کھاکرے نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ تلسی کی نگاہیں نیچی ہو گئیں۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی چولی پر گیا۔ کھاکرے کا ہاتھ تلسی کے ہاتھ پر گیا۔ تلسی چیخی۔

"مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔!"

کھاکرے کو ٹوٹ لگ رہی تھی۔ اس کے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے دو کوزے پانی پی کر بھی اس کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ اس کی لالچی آنکھوں میں شراب کی بوتل ڈولنے لگی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی خواہش کو چھپاتے ہوئے بڑی نرمی سے کہا:۔

"مجھے دے بدھے۔ میں تائی کے لئے دوا لے کر آتا ہوں۔"

"میرے پاس نہیں ہیں۔"

"تو جھوٹ بولتی ہے۔"

"گنگا مائی کی قسم۔"

"جھوٹ مت بول! پیسے ادھر لا!!"

"نہیں۔ میں نہیں دوں گی۔" تلسی چلا کر بولی۔

"کیسے نہیں دے گی۔"

تلسی نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی چولی پر رکھ لئے تھے۔ ٹھاکرے نے بڑی سختی سے تلسی کے دونوں ہاتھ اس کی چولی سے جھٹک دیئے۔ تلسی نے پھر اپنے سینے سے لگا لئے وہ زور زور سے ہانپ رہی تھی۔ کبھی کسی طرح وہ یہ دس روپے نہیں دے گی۔ تلسی اور ٹھاکرے میں لڑائی ہونے لگی۔ تائی آنکھیں کھول کر وحشیانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اب ٹھاکرے بھی ایک وحشی جانور کی طرح تلسی پر جھپٹ پڑا۔ تلسی اپنے جسم و جان کا زور لگا کر مدافعت کر رہی تھی۔ مگر ٹھاکرے نے اس کی چولی کو پھاڑ ڈالا۔ اور ننگی چھاتیوں کے اندر مجھے، دبا ہوا دیکھ کر خوشی کی ایک چیخ ٹھاکرے کے منہ سے نکل گئی۔ خوشی کی یہ چیخ۔ ننگی چھاتیوں کو دیکھ کر نہیں نکلی تھی۔ ان کے اندر دبے ہوئے کاغذ کے پرزے کو دیکھ کر نکلی تھی۔ اس نے جھپٹا مار کر، مجھے، وہاں

سے اٹھالیا۔ اور جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔

جھونپڑوں کو پھلانگتا۔ دلدل کو پار کرتا۔ سڑک پہ دوڑتا ہوا لکھارے غصے میں بھرا ہوا سوچنے لگا...... مجھے کیا سمجھتی ہے؟ میں اتنا نیچ پتھر دل جاہل اور ظالم ہوں کہ اپنی بیٹی کے دوا کے پیسوں کی شراب پی جاؤں گا؟ میں یہاں سے سیدھا ہری داس کیمسٹ کے اسٹور میں جا کر تانی کے لئے دوا لوں گا۔ جتنے کی بھی دوا آئے۔ دس کی آئے۔ پانچ کی آئے۔ آٹھ کی آئے۔ دوا لے کر۔ اور باقی پیسے مٹھی میں داب کر سیدھا واپس گھر پہنچوں گا۔ دوا اور باقی پیسے تلسی کے منہ پر مار دوں گا۔ یہ عورتیں سمجھتی ہی نہیں ہیں۔ مرد کیوں پیتے ہیں؟ ارے ہم کیا کوئی مزے کی خاطر پیتے ہیں؟ دن بھر بلڈنگ میں اینٹ پتھر، گارا، چونا، سمنٹ ڈھوتے ڈھوتے جب بدن کا پلستر اکھڑنے لگتا ہے تو دو گھونٹ پیتے ہیں۔ دن بھر کی مشقت سے ٹوٹ جانے والی ہڈیوں کو پھر سے جوڑنے کے لئے۔ بند بند اور جوڑ جوڑ میں ابھرنے والی تھکن کو دور کرنے کی خاطر، چند گھنٹوں کے لئے اپنے جھونپڑے کی کال کوٹھری میں بے سدھ ہو کر پڑ جانے کی خاطر، صرف زندہ رہنے کی خاطر، صرف دو روپئے روز کی خاطر۔

چند لمحوں کے لئے لکھارے ڈھونڈو کے قمار خانے کے قریب سے گذرتا ہوا رک گیا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر قمار خانے کے بوسیدہ دروازے کی طرف

دیکھا۔ پھر اس نے آہستہ سے اپنی مٹھی کھولی۔ "تجھے" دیکھا۔ مٹھی اور کھولی۔ "تجھے" دونوں ہاتھوں میں لے کر میری شکنوں کو صاف کیا۔ "تجھے" الٹ پلٹ کر غور سے دیکھا پھر مسکرا کر اپنی جیب میں ڈال کر آگے چلا۔ . . . . . . . . نہیں۔ . . . . کھا کرے نے اپنے آپ سے کہا۔ میں ڈھونڈو کے قمار خانے میں نہیں جاؤں گا۔ میں سیدھا ہیری راس کیمسٹ کی دوکان پر جاؤں گا اور ان دس روپوں سے اپنی بیٹی کے لئے دوا خریدوں گا۔ تلسی کتنی حیران ہو جائے گی۔ مجھے دوا لاتے دیکھ کر۔ یقین نہ آئے گا۔ اسے مجھے دوا لاتے دیکھ کر۔ تلسی مجھے سمجھتی نہیں ہے۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ ایک باپ ہوں۔ دل رکھتا ہوں۔ مجھے بھی اپنی بیٹی سے پیار ہے مجبور ہو کے پیتا ہوں۔ کوئی خوشی سے نہیں پیتا ہوں۔ مگر آج میں تلسی کو دکھا دوں گا۔ سمجھتی کیا ہے مجھے! ؟ حرام زادی چھنال۔ کس کس طرح ناخنوں سے منہ نوچا ہے اس نے میرا۔ دوا لے کر جاؤں گا تو سالی سے سمجھ لوں گا۔ ایسی کرڑ لکے کی ماردوں گا کہ دس دن بستر سے ہل نہ سکے گی۔

تلسی کو پیٹنے کے لذیز خیال سے متاثر ہو کر وہ کئی قدم ڈھونڈو کے قمار خانے سے آگے چلا گیا۔ پھر یکا یک ٹھٹک کر رک گیا۔ آخر دو گھونٹ پی لینے میں ہرج ہی کیا ہے؟ دو بازی کھیل لینے میں کتنے پیسے خرچ ہو جائیں گے؟ پانچ روپے کی دوا لاؤں گا۔ پانچ روپے قمار خانے میں خرچ کر دوں گا۔

اور تلسی کو کیا پتہ چلے گا کہ دس دو پیسے کی دوا لایا کہ پانچ روپے کی؟ عورتیں نوبے وقوف ہوتی ہیں۔ اُسے کیا پتہ چلے گا۔۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔ تانی؟

تانی بچ جائے گی۔ کیا ہے اُسے؟ بس بخار ہی تو ہے۔ پچھلے سال اسے ہیضہ ہوا تھا تو وہ بچ گئی تھی۔ اس سے پچھلے سال اُسے نمونیا ہوا تھا، تو وہ بچ گئی تھی۔ اُس سے دو برس پہلے اُسے چیچک نکل آئی تھی تو وہ بچ گئی تھی غریبوں کے بچے اتنی آسانی سے نہیں مرا کرتے۔ اور یہ تانی ضرور بچ جائے گی۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر نہیں۔۔۔۔۔۔۔ مجھے فوراً دوا لے کر واپس جانا چاہیئے وہ جلدی جلدی چلنے لگا۔ پھر رُک گیا۔ پھر آہستہ آہستہ سر جھکا کر دھیرے دھیرے چلنے لگا۔ اچھا پانچ نہیں خرچ کروں گا۔ صرف دو روپے کی شراب لوں گا۔ اور ایک روپے کا جوا کھیلوں گا۔ پانچ بھی نہیں صرف تین روپے۔ دس روپوں میں صرف تین روپے خرچ کروں گا۔ بہت ہوگیا۔ تو اوپر سے تھیلا مار کہ ایک بیڑی کا بنڈل۔ یکا یک اس کی سوکھی زبان پر شراب کا تلخ ذائقہ ابھرنے لگا۔ اس کے نتھنوں میں بیڑی کا دھواں چکر کھانے لگا۔ اُس کے ہاتھوں کی انگلیاں تاش کو چھونے کے لئے بے تاب ہونے لگیں۔ اب وہ یوں چل رہا تھا جیسے وہ اپنے تھکے ہوئے پیروں میں لوہے کی وزنی بیڑیاں گھسیٹتے ہوئے چل رہا ہو۔ یکایک وہ چلتے چلتے رک گیا۔ بالکل بے بس ہو کر ڈھونڈو کے قمار خانے کے دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔

کندوا اور جُما اس کے دو ساتھی اور دوست ہنستے بولتے چال لئے قمار خانے میں داخل ہو رہے تھے۔ دروازہ کھول کر وہ دونوں داخل ہو گئے تھے۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ قمار خانے کی اندر کی فضا اب کھاکرے کی آنکھوں کے آگے تصویریں کھینچنے لگی۔ وہ دونوں ایک میز پر بیٹھ کر شراب کی بوتل کا آرڈر کر رہے تھے۔ بوتل ان کے سامنے آ گئی تھی۔ اور پھر تاش کے پتے فضا میں ایک رنگین دھنک کی طرح بکھرنے لگے۔ کھاکرے کے لئے اس کے آگے سوچنا ناقابل برداشت ہو گیا وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا قمار خانے کی جانب بڑھنے لگا۔ مگر اندر جانے سے قبل ہی گویا وہ قمار خانے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں قمار خانے کی مانوس فضا تھی۔ دوستوں کے قہقہے اور تیل میں بھنی ہوئی مچھلی کی اشتہا انگیز بُو اور تاش کے پھسلتے ہوئے، پھسلتے ہوئے نرم گرم پتے۔ یہ دنیا باہر کی دنیا سے کتنی مختلف تھی جہاں ہر لحظہ جان لیوا محنت کرنی پڑتی ہے۔ پھر کتنی ہی محنت کرو۔ ملتے دو روپئے ہی ہیں۔ صرف دو روپئے روز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

رات کے بڑھتے ہوئے اندھیروں میں تلسی نے اُسے قمار خانے میں

جاکر پکڑا۔ جب وہ کھاکرے کی کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی تو یکایک قمار خانے میں سناٹا چھا گیا۔ وہ اسقدر چپ تھی۔ اسقدر ٹھنڈی اور مطمئن تھی اور اسقدر پتھر صورت لے کر آئی تھی کہ اُسے دیکھتے ہی چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ کھاکرے کے دوستوں نے پتے پھینکنا بند کر دیا۔

"چلو!" کھاکرے نے شراب کے گہرے نشے میں پھنکار کر کندرو سے کہا مگر کندرو نے پتہ نہیں چلا۔ وہ کھاکرے کے عین پیچھے دیکھ رہا تھا۔ کھاکرے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پیچھے مڑا تو اسے تلسی نظر آئی۔

"کیوں آئی ہے؟ گھر جاؤ!" کھاکرے نے غصے میں دونوں ہاتھ چھلاتے ہوئے کہا ہاتھ جھلاتے ہی نشے میں اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ کرسی سے نیچے گر پڑا۔ کسی نے اُسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی تلسی نے وہیں کھڑے کھڑے گرے ہوئے کھاکرے سے مخاطب ہو کے بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "گھر چلو! نانی مر گئی ہے۔"

کھاکرے کا گرا ہوا سر فرش سے اوپر اٹھا۔ وہ پھٹی پھٹی نشہ زدہ نگاہوں سے گھور کر تلسی کی طرف دیکھنے لگا۔ . . . . . کیا کہتی ہے تو؟"

یہی کہہ رہی ہوں۔ نانی مر گئی ہے۔ اٹھو گھر چلو۔

کھاکرے نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے دونوں ہاتھوں نے

کرسی کے ایک پائے کو جکڑ لیا تھا۔ وہ کرسی کے پائے کے سہارے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکایک اس نے کرسی کے پائے کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور روتے روتے کہنے لگا۔

"نہیں تو جھوٹ بولتی ہو۔ تانی نہیں مر سکتی۔ میری تانی نہیں مر سکتی۔"

جما اور کندرو اپنی کرسیوں سے اٹھ کر اُسے اٹھانے لگے۔ اب وہ فرش پر کھڑا لڑکھڑا رہا تھا۔ تلسی نے آگے بڑھ کر اُسے سہارا دیا۔ اور اس کے جسم کو کھاکرے سے قمار خانے سے باہر دروازے کی طرف لے جانے لگی کہ قمار خانے کا مالک ڈھونڈو آگے بڑھا اور بولا:۔

"ساڑھے بارہ روپئے دیتے جاؤ۔"

پھر اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر کھاکرے کی جیب ٹٹولی اور "مجھے" نکال لیا۔ "مجھے" دیکھ کر اور پہچان کر بولا:۔

"یہ دس روپئے ہیں۔ باقی ڈھائی روپئے تم پر قرض رہا۔"

تلسی کوئی جواب دیئے بغیر روتے روتے کھاکرے کو قمار خانے سے باہر لے گئی۔ ڈھونڈو دیر تک دروازے میں کھڑا رہا۔ "مجھے" ہاتھ میں لئے۔

کھاکرے ایک بچے کی طرح سر جھکائے سسکیاں بھرتا ہوا تلسی کے ساتھ اپنے گھر کو جا رہا تھا۔ میں ایک مجرم کی طرح ڈھونڈو کے ہاتھ میں کانپ

رہا تھا۔

جیب ڈھونڈو واپس قمار خانے میں آیا تو سب اس کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ صرف خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یکایک ڈھونڈو غصّے سے بھر کر بولا۔

"تو کیا کروں؟ کس کس پر ترس کھاؤں؟ یہاں سب غریب ہیں۔" وہ غصّے سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر بھی جب کوئی نہیں بولا۔ تو وہ آپ ہی آپ بول پڑا۔ . . . . "میری مصیبت کوئی نہیں جانتا۔ کیسے کیسے جتن کر کے یہ اڈّا لاتا ہوں۔ پولیس والوں، کسٹم والوں، میونسپلٹی والوں کو دے کر میرے پاس بچتا ہی کیا ہے؟ میں ترس نہیں کھا سکتا۔!"

اتنا کہہ کر ڈھونڈو نے دراز کھول کر پیسے، گلے میں ڈال دیا۔ اتنے میں ایک لڑکا ہاتھ میں تھیلا لیکر آیا اور کاونٹر پر جھک کر بڑی رازداری سے ڈھونڈو سے مخاطب ہوا۔

"سیٹھ نے اس کاٹ وہسکی کی ایک بوتل مانگی ہے۔"

"ایک سو اسّی روپے ہوں گے۔" ڈھونڈو نے اس کے کان میں کہا۔

لڑکے نے سو کے دو نوٹ ڈھونڈو کے سامنے رکھے۔ ڈھونڈو نے جلدی سے اُن پر ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکے کو اشارہ کر کے کاونٹر کے پیچھے اندر

کرے میں لے گیا۔ بلیک ڈاگ کی ایک بوتل نکال کر لڑکے کو دی۔ لڑکے نے تھیلے میں چھپا لی۔ واپس آکر ڈھونڈھوتے کاؤنٹر کی دراز کھول کر "مجھے" نکالا۔ میرے ایک اور بھائی کو نکالا۔ بیس بیس کے دو لوٹ لیے کر لڑکا تھیلا اٹھائے باہر چلا گیا۔

دوسرے دن سیٹھ گوکل داس کوئی گیارہ بجے کے قریب بستر سے اٹھے۔ رات کا Hangover دور کرنے کے لئے اس نے ہاتھ نیچے کر کے پلنگ کے نیچے رکھی ہوئی۔ بلیک ڈاگ کی بچی کچی وہسکی ایک گلاس میں انڈیلی۔ سگریٹ کے پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا پاکٹ، خالی تھی۔ اس نے پلنگ سے لگے ہوئے بجلی کے بٹن کو دبایا۔ کل رات والا نوکر ایک اخبار لے کر اندر آیا۔ سیٹھ نے اپنا بٹوہ کھولا۔ جہاں میں دوسرے نوٹوں کے ساتھ پڑا ہوا سوتا تھا۔ سیٹھ نے مجھے ہاتھ لگایا۔ پانچ کے نوٹ کو ہاتھ لگایا۔ پھر دو روپے کا ایک نوٹ نکال کر نوکر کو دیتے ہوئے بولا۔

"ایک پاکٹ گولڈ فلیک کا لے کر آؤ!"

لڑکا دو روپے کا نوٹ لے کر چلا گیا۔ بٹوہ سیٹھ کی گود میں کھلا پڑا تھا۔ سیٹھ نے وہسکی کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے اخبار کھولا پہلے صفحے پر سیٹھ گوکل داس کی تصویر تھی۔ کیونکہ اس نے کل رات ہی ایک لاکھ روپے کا چندہ فوجی ڈیفینس فنڈ میں دیا تھا۔ تانی کے مرنے کی کوئی خبر نہ تھی۔

# دوسرا باب

اُس کے بعد تین دن تک سیٹھ گوکل داس کی جیب میں رہا۔ اس جیب کے بٹوے میں میرے ساتھ رہنے والے طرح طرح کے نوٹ تھے۔ ایک روپے کے نوٹ۔ دو روپے کے نوٹ۔ سو روپے کے نوٹ۔ ہزار روپے کے نوٹ سیٹھ کا بٹوہ نوٹوں سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ اس بٹوے کا کھولنے کا موقع نہ آیا ہو۔ اگلے تین دن میں کئی بار وہ بٹوہ کھلا اور بند ہوا۔ کئی بار اس میں سے دس کے، سو کے، ہزار کے نوٹ نکلے۔ اور ان کی جگہ دوسرے نوٹ آ گئے۔ ہم نوٹوں کی زندگی میں یہی ہوتا ہے، ایک آتا ہے، دوسرا جاتا ہے۔ ثباتِ مدام کسی کو حاصل نہیں ہے۔ ہر بٹوہ سرائے فانی ہے۔

تین دن تک بڑے مزے کئے۔ سیٹھ کا بٹوہ عمدہ مرا کو چمڑے کا تھا جس
کے اندر مہین ریشم کا استر تھا۔ اس نرم اور گدگدے ریشمی بستر پر آرام سے
لیٹے رہے۔ لگتا تھا جیسے تاج محل ہوٹل میں کمرہ ریزرو کرا کے استراحت
فرما رہے ہوں۔ دس پانچ دو ایک کے نوٹوں سے بہت جلدی دوستی
ہو گئی۔ کیونکہ ہم لوگوں کے حالات ایک ہی جیسے تھے۔ زندگی بھی تقریباً
ایک ہی سی تھی۔ اس لئے ہم لوگ بہت جلد ایک دوسرے
سے گھل مل کر گڈ مڈ ہو گئے۔ البتہ سو کے نوٹ اور ان کے آگے ہزار
کے نوٹ اپنی صفیں الگ بنائے بیٹھے رہے۔ ہم کرنسی نوٹوں میں
اونچ نیچ کا جذبہ بہت ہے۔ دس کا نوٹ اپنے آپ کو دو کے نوٹ
سے اونچا سمجھتا ہے۔ اور ہزار والا نوٹ نگاہ اٹھا کر دس کے نوٹ
کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ نوٹوں کی زندگی میں عدم مساوات کی شدت
ہے۔ ہر نوٹ کی کلاس الگ ہے۔ پانچ کے نوٹ سے دس کی قیمت زیادہ ہوتی
ہے۔ اسلئے دس کے نوٹ کا مرتبہ بھی بڑا ہوتا ہے اور ہزار کا نوٹ تو گویا نجیب
الطرفین ہوتا ہے۔ عمدہ دبیز کاغذ بہترین طباعت۔ صاف ستھرا اور چمکدار۔ اسے
بہت کم انسانی ہاتھوں سے چھوا جاتا ہے۔ اور جب چھوا جاتا ہے
تو اس قدر احتیاط سے ڈرتے ہیں جیسے وہ نوٹ نہ ہو کوئی مقدس کتاب یا صحیفہ
آسمانی ہو۔ میں نے ان تین دنوں میں اپنے بھائی بندوں کو بہت

سمجھایا۔ بتایا کہ ہم میں سے کوئی آسمان سے نہیں اترا ہے۔ ہم سب لوگ ایک کاغذ کے بنے ہیں، اور ناسک کے ایک ہی پریس سے شائع کئے گئے ہیں۔ ہمارا آغاز ایک ہی نہ ہے۔ اور انجام بھی ایک ہی ہے۔ یعنی سبھی کو خرچ ہوتا ہے۔ چاہے وہ ایک کا نوٹ ہو یا ایک ہزار کا۔ مگر میری آواز کو کاغذ کے ایک حقیر پرزے کی کھڑکھڑاہٹ سے زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ لہذا میں چپ ہو گیا۔

تین دن کے بعد گنیش چترتھی تھی۔ علی الصبح سیٹھ صاحب نے بہت عمدہ اشنان کیا۔ ایک شفاف کوری چٹی دھوتی پہنی۔ ریشمی کرتا پہنا۔ جس میں سونے کے بٹن ٹکے ہوئے تھے۔ ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگایا۔ کانوں میں ہیرے کے بندے پہنے۔ بہت سے نوٹوں سے اس نے اپنے بٹوے کو بھر لیا۔ اب ہم لوگ گویا بٹوے میں ٹھنسے بیٹھے تھے۔

اس کے بعد سیٹھ نے اپنی کیڈی لیک کو طرح طرح کی ڈالیوں سے بھر لیا۔ دو نوکر اور ایک منیم ساتھ میں لئے اور صبح کے آٹھ بجے ہی گھر سے نکل گیا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب گاف روڈ کی ایک بڑی کوٹھی کے دروازے پر سیٹھ نے الکھ جگائی۔

ایک نوکر باہر آیا۔ سیٹھ نے پہلے ہی سے ٹیلیفون کر رکھا تھا۔ اور نوکر بھی اُسے شاید پہلے ہی جانتا تھا۔ کیونکہ وہ اُسے دیکھتے ہی

اس کا نام پوچھے بغیر اندر لوٹ گیا۔ چند منٹ بعد پھر نمودار ہوا۔ اور سیٹھ گوکل داس کو اشارے سے بُلا کے اندر لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں ایک ذہین چہرے والا چھوٹے قد کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ صورت شکل سے دو روپئے کا نوٹ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ماتھے پر بھی چندن کا ٹیکہ لگا تھا۔ کیونکہ آج گنیش چترتھی کا تیوہار تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اس مقدس تیوہار کے لئے مبارک باد دی۔ ہاتھ ملایا۔ ٹھنڈا شربت پیا۔ پھر سیٹھ نے ادھر ادھر دیکھ کر اس پستہ قد والے آدمی سے کہا، کہ اُسے پیشاب لگا ہے۔ پستہ قد والا آدمی مسکرا کر اپنی کرسی سے اٹھا اور سیٹھ کو ٹائیلٹ کا کمرہ دکھانے لے چلا۔ ٹائیلٹ کا کمرہ دکھا کے واپس ہونے ہی والا تھا۔ کہ سیٹھ نے اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ اور اس پستہ قد آدمی کے پاؤں پر گر پڑا۔ پھر پاؤں چھو کر اس نے اپنے بٹوے کو چھوا۔ اور اس میں سے پچاس ہزار کے نوٹ نکال کر اس پستہ قد آدمی کے ہاتھ میں زبردستی تھما دیئے اور پھر اس کے پاؤں چھو کر کہنے لگا۔

"میری فائل پر دستخط کر دیجیے۔ نہیں تو میں تباہ ہو جاؤں گا سبرامنیم صاحب!"

اس پستہ قد آدمی نے کہ جس کا نام سبرامینم تھا۔ بڑی

شفقت سے کہا۔

"آپ نے خواہ مخواہ یہ سب کھڑاگ کیا۔ میں تو رشوت کسی سے نہیں لیتا۔ اور یہ میرا اصول ہے۔"

"میں بھی رشوت کسی کو نہیں دیتا۔" سیٹھ بولا۔ "یہ میرا بھی اصول ہے۔ مگر یہ رشوت تو نہیں ہے۔ گنیش چترتھی کے تیوہار کی مٹھائی ہے۔"

"مٹھائی ہے تو ٹھیک ہے۔" سیرا منیم نے پچاس ہزار کے نوٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "مگر آیندہ کیلئے بھی یہ یاد رکھئے گا۔ میں رشوت نہیں لیتا۔ ویسے آپ کا کیس مضبوط ہے۔ کل رات میں آپکی فائل دفتر سے گھر لیتا آیا تھا۔ آپ کے سامنے دستخط کر دیتا ہوں۔ اسے لے کر فوراً میرے ڈپٹی کے پاس چلے جائیے۔ وہ مناسب احکام جاری کر دے گا۔ ٹھیکہ آپ کو ضرور مل جائے گا۔"

گاف روڈ سے سیٹھ گوکل واپس چیتن روڈ گیا۔ وہاں بھی گھنٹی بجائی۔ وہاں بھی نوکر باہر آیا۔ نام پوچھے بغیر اندر لوٹ گیا۔ کیونکہ سیرا منیم نے ڈپٹی کو ٹیلیفون کر دیا تھا۔ وہاں بھی سیٹھ کو بڑے زور کا پیشاب لگا۔ وہاں بھی اُسی طرح بیوالٹی میں باتیں ہوئیں۔ اسی طرح ڈپٹی نے سات ہزار کی رشوت لینے سے صاف انکار کر دیا۔ آخر جب سیٹھ نے سمجھایا کہ یہ رشوت

نہیں ہے۔ محض گنیش چترتھی کے تیوہار کی مٹھائی ٹہ ہے تو کہیں جا کے وہ راضی ہوا۔ اور اُس نے فائل پر مناسب احکام جاری کر کے سیٹھ کو متنبہ کیا کہ وہ فوراً سیکشن آفیسر کی کوٹھی پر جا کے مزید احکام حاصل کرلے۔ میں اُسے ٹیلیفون کئے دیتا ہوں۔

جب سیٹھ سیکشن آفیسر کے بنگلے سے لوٹا تو بہت خوش تھا۔ حالانکہ اس کا بٹوہ تقریباً خالی ہوچکا تھا۔ مگر وہ بے حد خوش تھا۔ سیکشن آفیسر کے بنگلے سے نکلتے ہی اُس نے ڈرائیور سے کہا۔

"سیدھے گنیش جی کے مندر لے چلو۔!"

آج مندر میں بہت بھیڑ تھی۔ ہر شخص اپنی حیثیت اور مرتبے کے مطابق گنیش جی سے سودا کرنے آیا تھا۔ اُسی حساب سے مندر میں اپنی جگہ پہ کھڑا تھا۔

کیونکہ شہر میں یہ گنیش جی کا سب سے بڑا مندر تھا۔ اس مندر میں گنیش جی کی جو مورتی تھی، وہ خالص سونے کی بنی ہوئی تھی۔ اور جواہرات کے قیمتی زیورات پہنے ہوئے تھی۔ یوں تو ہر روز بھگت لوگوں کو مندر کے اندورنی آہنی دروازے تک آنے کی اجازت تھی۔ جس کے اندر سونے کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ لیکن آج گنیش چترتھی کے دن بے حد اژدحام ہونے کی وجہ سے درجے مقرر کر دیئے جاتے تھے۔ مندر

کے آہنی دروازے تک وہی لوگ آ سکتے تھے۔ جو دس روپے کا نقد چڑھاوا چڑھا سکتے ہوں۔ اُن کے پیچھے پانچ روپے خرچنے والوں کی قطار تھی۔ اُن سے پرے تین روپے والے تھے۔ سب کے آخر میں ایک روپے والے تھے۔ مندر کیا تھا۔ سیٹھ کا بٹوہ تھا۔ جس میں انسان کاغذی نوٹوں کی طرح اپنی حیثیت اور مرتبے اور چھاپے کے اعتبار سے کھڑے تھے۔ مندر کے آنگن سے باہر خلقت کا ایک اژدہام تھا۔ جو صرف پھل اور پھول لے کر آئے تھے۔ ٹٹ پونجیے!۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سیٹھ گوکل داس نے بٹوہ کھول کر اندر دیکھا۔ اندر پانچ دو، ایک کے بہت سے نوٹ تھے۔ باقی سب نوٹ ختم ہو چکے تھے۔ دس کا نوٹ بھی صرف میں ہی باقی رہ گیا تھا۔ سیٹھ نے مجھے بٹوے سے باہر نکالا۔ دروازے کے اندر گنیش استتی گنگناتے ہوئے پجاری کے ہاتھوں میں دس کا نوٹ دیا۔ دونوں ہاتھوں سے جوڑ کر مورتی کو نمسکار کیا! اور مندر سے واپس ہونے لگا۔

پجاری نے مجھے گنیش جی کے چرنوں میں گرا دیا۔ جہاں پہلے ہی سے بہت سے نوٹوں کا انبار لگا تھا۔ وہ مسلسل استتی گنگنائے جا تا تھا اور ایک لمحے کے لئے چپ نہ ہوتا تھا۔ دو پجاری باری باری گھنٹے بجائے جا رہے تھے۔ دو اور پجاری ایک کونے میں بیٹھے

ہوئے مالا جپ رہے تھے۔ ایک پجاری مالا جپتے جپتے ادھ مندی
آنکھوں سے ایک دو اور پانچ کے نوٹوں کی گنتی کرتا جاتا تھا۔ دوسرا
دس کی۔ ایک نوٹ پر ایک مالا کا منکا گھوم جاتا تھا۔ شری گنیش آئینمہ۔ دو
نوٹ کے اوپر دو منکے۔ پانچ کے نوٹ پر پانچ منکے۔ جلدی جلدی شری گنیش
شری گنیش شری گنیش آئینمہ کہتے ہوئے گھوم جاتے تھے۔ اس سے چڑھاوے
کا حساب بھی ہوتا رہتا تھا۔ اور دیوتا کی پوجا بھی ہوتی رہتی ہے۔ پجاری منگل
دیو اس مندر کا مہنت تھا اور اس مندر کی مہنتائی سات پشتوں سے اس کے
خاندان میں چلی آرہی تھی۔ وہ مالا بار ہل پر رہتا تھا۔ اور شام ہوتا دن ہی مندر
میں آکے اپنے بھگتوں کو درشن دیتا تھا۔ پوجا کے کام کے لئے اس نے
تین پجاری تنخواہ پر رکھے ہوئے تھے۔ سب کو ہر ماہ دو سو روپیہ مہینہ
ملتا تھا۔ دو پجاری مالا جپ کر حساب کرنے والے الگ تھے۔ انہیں ڈھائی
سو روپیہ مہینہ ملتا تھا۔ کیونکہ ان کا کام بھی ٹیڑھا تھا۔ وہ چڑھاوا
لینے والے پجاریوں پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ان چاروں سے اوپر مہنت
کا خاص آدمی تھا۔ جو سب سے پیچھے کھڑا ہو کر گنیش جی کی مورتی کو
چنور جھلتا تھا۔ اور باقی سب پجاریوں پر نگاہ رکھتا
تھا۔ وہ ساڑھے تین سو روپئے تنخواہ پاتا تھا۔ اس کے علاوہ مہنت
جی نے اسے اپنی مالا بار ہل کی کوٹھی میں دو کمرے الگ سے دے

رکھے تھے ۔ رات کو چڑھاوا سمیٹ کر وہی لے جاتا تھا ۔ اس کا نام
روی شنکر تھا ۔

آج گیارہ ہزار روپئے کا چڑھاوا چڑھا تھا ۔ ساڑھے آٹھ بجے
روی شنکر نے مندر کا آہنی دروازہ بند کیا ۔ اور پجاریوں کو باہر آنگن
کی کوٹھریوں میں جانے کی اجازت دی ۔ آہنی دروازے کا الیکٹرک الارم آن
کیا ۔ رات کو کوئی چور تو کیا خود کوئی پجاری تک مندر کے اس دروازے کو
ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا ۔ الارم فوراً بجنا شروع ہو جائے گا ۔ علاوہ
ازیں مندر کے آنگن میں تین چوکیدار بھی تھے ۔ جو رات کو ہر وقت
پہرہ دیتے رہتے تھے ۔ روی شنکر نقدی، نوٹ اور زیورات چڑھاوے کے سمیت
کر مہنت کی گاڑی میں بیٹھ کر واپس کوئی نو بجے کے قریب
مالا بار ہل پر پہنچا ۔ وہاں مہنت منگل دیو بڑی بے چینی سے
اس کا انتظار کر رہا تھا ۔ کیونکہ اسے کہیں اور جانا تھا ۔ اور
اسے دیر ہو رہی تھی ۔

روی شنکر نے حسب حساب کتاب مع چڑھاوے کے مہنت کے چرنوں
میں رکھ دیا تو مہنت منگل دیو کو بہت غصہ آیا ۔ بولا ۔

پچھلے سال تو پندرہ ہزار کا چڑھاوا تھا ۔ اس سال گیارہ ہزار
کا کیسے ہوا ۔؟ اکرم اتفاقی ہے ۔ How is it possible ? sudden

fall.

مہنت منگل دیو کانونٹ کا پڑھا ہوا تھا۔ اور بہت اچھی انگریزی جانتا تھا اور اس وقت غصّے میں انگریزی کے بہت سے فصیح جملے اس کی زبان سے خود بخود ادا ہو گئے۔

روی شنکر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔۔۔۔ !! یہ کلجگ ہے دھرم نشٹ ہو رہا ہے۔"

" کلیگ ہے پچھلے سال نہیں تھا کیا؟" مہنت منگل دیو غصے سے پیر پٹک کر بولا۔

" اتنا سڈن ( sudden fall ) کیسے؟'

It is incomprehensible

میرا مندر شری گنیش جی کا سب سے قدیم مندر ہے۔ شہر کے عین مرکز میں واقع ہے۔ مورتی خالص سونے کی ہے۔ اگر اسی طرح مندر کا چڑھاوا کم ہونے لگا تو سارا بزنس چوپٹ ہو جائے گا روی شنکر۔

جب مہنت منگل دیو کچھ ڈھیلا پڑا تو روی شنکر پجاری نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔۔۔۔ گرو دیو! آجکل مہنگائی کا زمانہ ہے۔ جو سیٹھ گنیش چترتھی پر سو روپئے چڑھاتا تھا۔ آجکل دس روپئے دے کر رخصت ہو جاتا ہے۔ دس

روپئے والا دور دپیئے دیکر رفو چکر ہو جاتا ہے ایک روپئے والا دو پھول چڑھا کر اپنی شردھا پوری کر لیتا ہے۔ اس مہنگائی کے زمانے میں اتنا بھی ہو گیا تو بہت ہے مالک!" اتنا کہہ کر اس نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

منگل دیو کچھ کہنے والا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی ٹیلیفون اٹھا کر اس نے بات کی تو اسکا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ "ابھی آتا ہوں" کہہ کر چونگا رکھ دیا۔ چڑھاوے میں سے چند سو کے نوٹ، اور چند دس کے نوٹ نکال کر اپنی جیب میں رکھے پیں بھی اس کی جیب میں چلا گیا۔ پھر منگل دیو نے چابیوں کا ایک گچھا جیب سے نکال کر باقی چڑھاوے کو اپنے سامنے ردی شنکر سے ایک تجوری میں بند کروایا اور اُسے پورچ میں گاڑی منگانے کا حکم دیا۔

گنیش چترتھی کے دن مشہور تھا کہ مہنت منگل دیو دن بھر گھر میں برت رکھتے ہیں۔ اور انتر دھیان ہو کر گنیش جی کی پوجا کرتے ہیں۔ اور جب رات ہو جاتی ہے تو سب کی نگاہوں سے چھپ کر سمندر کے کسی اکیلے ساحل پر چلے جاتے ہیں۔ اور ریت پر سمادھی جما کر رات بھر اپنے اشٹ دیو کی استتی کرتے ہیں منگل دیو کا چہرہ گول، رنگ گورا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور آواز بیحد رسیلی تھی۔ وہ بڑی خوبصورت آواز میں بھجن گاتا تھا۔ اور سال کے سال دس دن کے لئے "سی" ہال میں گنیش سبھا پر بڑے زور دار لیکچر انگریزی میں دیتا تھا۔

# تیسرا باب

جب گاڑی پورچ میں آ گئی تو اس نے اُٹھ کر اپنی ریشمی دھوتی کی سلوٹوں کو ٹھیک کیا۔ اتنے میں اس کی بیوی بھی اندر آ گئی تھی اور اس کے پاؤں چھو رہی تھی۔ کیونکہ وہ اس کا شوہر ہی نہیں تھا۔ ایک مقدس مہنت بھی تھا۔ جو اس وقت رات کے سناٹے میں سمندر کے ساحل پر رات بھر کے لئے سمادھی لگانے جا رہا تھا۔ منگل دبو نے بڑی گہری سنجیدگی سے اپنی بیوی کے سر پر ہاتھ رکھا اور باہر پورچ میں آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یہ ایک پرانی کالے رنگ کی ایمبا سیڈر تھی۔

کارنک روڈ کے پیٹرول پمپ کے قریب نالے پر اس کی ایمبا سیڈر رُک گئی۔ مہنت منگل دبو اس میں سے نکلا اور ایمبا سیڈر کے آگے کھڑی ہوئی

ایک پہانی رولڈز موبائل میں بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی وہ پہانی گاڑی چل پڑی اور پہلی گاڑی واپس ہو گئی۔

پھیرالمونٹ کے ہل پوائنٹ پر جا کے یہ گاڑی بھی رک گئی۔ یہاں پر ایک شاندار امپالا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس امپالا کے اندر سبز رنگ کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔ ہہنت منگل دیو اولڈز موبائل سے نکلا اور امپالا میں سوار ہو گیا۔ اولڈز موبائیل واپس ہو گئی۔ جب اولڈز موبائل نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے امپالا کے ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔

انہیں پیرا مونٹ ہل پوائنٹ سے کہیں بہت دور نہیں جانا تھا۔ پھر بھی وہ ادھر ادھر چکر کاٹتے رہے۔ اوپر نیچے سڑکوں پر جاتے رہے۔ آخر ہہنت منگل دیو نے جب گھڑی دیکھ کر اندازہ لگایا کہ دس بج رہے ہیں اور کوئی اس کا پیچھا نہیں کر رہا ہے تو اس نے ڈرائیور سے سرگوشی میں کہا۔

"اب چلو۔"

گاڑی گھوم کر ثقافیتر بلڈنگ کے عقب میں داخل ہو گئی۔ ڈرائیور نے احتیاط سے چاروں طرف دیکھ کر امپالا کا دروازہ کھولا۔ ہہنت منگل دیو کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ عقبی لفٹ میں اسے لے گیا۔ جو صرف چند لوگوں کے لئے مخصوص تھی۔ لفٹ کے دونوں دروازے بند کئے اور اس وقت

تک باہر کھڑا رہا جب تک مہنت منگل دیو اُس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔

لفٹ ساتویں منزل پر پہنچ کر رک گئی۔ منگل دیو لفٹ سے باہر نکلا۔ مہا گنی کے ایک شاندار دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ اندر کے ٹیلی ویژن سیٹ سے کسی نے اُسے باہر کھڑے ہوئے دیکھا اور خوب اچھی طرح سے پہچان لیا تو دروازہ کھولا۔

"ہیلو منگلو!"

"ہیلو سوزی!"

یہ سوزی کا پرائیویٹ ہوٹل تھا یا کلب تھا۔ کچھ بھی کہیئے۔ صرف پچیس سوئٹ تھے دو کمروں کے اور یہ پچیس سوئٹ گذشتہ دس سالوں سے ہمیشہ بک رہتے تھے۔ بڑے بڑے لکھ پتی اور سرمایہ دار یا ٹھیکیدار اور بزنس مین ہی سوزی کے ہوٹل کے گاہک تھے۔ وہی گنے چنے لوگ۔ وہی جانی پہچانی صورتیں۔ برسوں کی شناسا اور ایک دوسرے کے گناہوں سے واقف۔ سوزی کا ہوٹل ایک ایسا بند دروازوں کا لا کلب تھا۔ جہاں بڑے اور متمول شہر کے چند باوقار شہری ہی داخل ہو سکتے تھے۔

"Hava Bar buzimers......؟" سوزی نے پوچھا۔

"........ Dail" منگل دیو نے جواب دیا۔

"آج ایسا مال منگایا ہے تمہارے لئے۔"

سوزی خوشی سے ہنسی "You will forget your blues."
منگل دیو کی آنکھوں میں بھی خوشی کی گہری چمک پیدا ہوئی۔ اُسے معلوم تھا۔
کہ سوزی کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔

سوزی اُسے اس کے سوئیٹ میں لے گئی۔ جسے دس سال سے منگل دیو نے
کرائے پہلے رکھا تھا۔ ایک دن کے لئے بھی نہیں چھوڑا تھا۔

سوئیٹ میں جو لڑکی بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی منگل دیو کے منہ سے رال ٹپکنے
لگی۔ بھاری سینہ پتلی کمر۔ بھاری کولھے۔ چمپئی رنگ۔ لانبا
شہزادیوں کا سا قد۔ گہری نشیلی آنکھیں۔ ایسا لگتا تھا۔
جیسے سوزی ایلورا کی کسی سندر دیو داسی کے بُت کو اٹھا
کے لے آئی ہے۔ اور ساڑی پہنا کے منگل دیو کے سوئیٹ
میں بٹھا دیا ہے اُسے۔

"کیوں؟" سوزی کا چہرہ منگل دیو کی طرف دیکھتے ہوئے خوشی سے
چمک رہا تھا۔

منگل دیو نے زیرِ لب کہا۔۔۔۔۔۔ "بالکل شہزادی لگتی ہے۔"
نام بھی اس کا شہزادی ہے۔ اس کی ماں بنجو را کے راجہ کے یہاں تخت راجہ
کے محل میں اس کی پیدائش ہوئی۔ شہزادیوں کی طرح پلی بڑھی۔ بھارت ناٹیم ناچنے

میں اس کا جواب نہیں ۔

شہزادی نے جو ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس پر کپڑا تو کہیں کہیں نظر آتا تھا۔ ورنہ ساری ساڑی سونے کے سچے گوٹے کی جھالردار لہریوں سے جگمگا رہی تھی۔ ہاتھوں میں جواہرات کے منقش کڑے کانوں میں جھم جھماتے کرن پھول اور گلے میں پکھراج کا گلو بند ۔ کہیں بھی نظر ٹھہرتی نہیں تھی . . . . . . . منگل دیو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ۔ یہ شفاف بلوریں جلد۔ یہ سانچے میں ڈھلا ہُوا جسم منگل دیو اُسے ہاتھ لگانے سے بھی ڈر رہا تھا۔

کہیں ہاتھ لگانے میں یہ نگاہوں سے اوجھل تو نہیں ہو جائے گی اسے گمان گزرا

شہزادی نے اس کی طرف دیکھ کر اُسے چھوٹی سی مسکراہٹ عطا کی۔ عورت کی پہلی مسکراہٹ ایسی ہی ہوتی ہے۔ منگل دیو نے سوچا ۔ ایک چھوٹے سے پیگ سے مشابہ ۔ وہ شہزادی کے قریب لیکن کچھ فاصلہ رکھ کے اس کے سرہانے پہ بیٹھ گیا، اور بوتل کھولنے لگا۔

چوتھے پیگ میں وہ اُس کے سامنے ناچ رہی تھی، اور اسکے جسم کے جنون خیز خم دیکھ دیکھ کر نشے کی وادی میں اترتا جا رہا تھا کہ اتنے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی ۔ منگل دیو نے اٹھ

کر دروازہ کھولا۔

دروازے پر اس کا دوست رفعت حسین، سید رفعت حسین رخشندی اپنی چھوٹی سی کھچڑی داڑھی کھجاتا ہوا۔ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کے ساتھ بھی ایک طرحدار لڑکی تھی۔ شکل و صورت سے بنگالن معلوم ہوتی تھی۔

بال کمر تک بکھرائے ہوئے پھول سجلئے ہوئے۔ پاؤں میں آلتا کی سُرخی۔ آنکھوں میں کسی شاعرانہ کرب کا اظہار، جیسے وہ آنکھیں ابھی رو دیں گی۔

"یہ سُدھا ہے...... کیا ہم اندر آ سکتے ہیں؟" رفعت حسین نے مسکراتے ہوئے منگل دیو سے پوچھا۔

"آؤ آؤ رفی"...... منگل دیو نے سُدھا کی طرف دیکھ کر رفعت حسین سے کہا۔

"ایک بہت بڑی خوش خبری لایا ہوں"........ رفعت حسین نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا ——— میں نے سپریم کورٹ سے مقدمہ جیت لیا ہے!"

منگل دیو نے یہ خبر سن کر دونوں ہاتھ بے اختیار پھیلا دیئے۔ دونوں دوست گلے ملنے لگے۔ جب پاکستان بنا تو منگلو بابا کے

مشہور مزار کا متولی فسادات سے ڈر کر پاکستان چلا گیا تھا۔ جہاں اس نے منگو بابا کے بڑے بھائی لنگو سائیں کے مزار پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے جاتے ہی سید رفعت حسین زخشندی نے جس کا اصلی نام شکورا تھا۔ اور جو ذات کا حجام تھا۔ اور اپنے علاقے کا مشہور غنڈہ تھا۔ اپنے آٹھ دس ساتھیوں کی مدد سے منگو بابا کے مزار پر قبضہ کر لیا۔ اس پر اصلی متولی کے اور بابا کے رشتے داروں نے جو ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سات برس تک مقدمہ چلتا رہا۔ معاملہ سپریم کورٹ تک گیا۔ آخر میں فیصلہ شکورے کے حق میں ہوا۔ یعنی سید رفعت حسین زخشندی کے حق میں۔ جو اس وقت سدھا بنگالن کو بغل میں دابے منگل دیو کے سامنے مسرور اور شاداں کھڑا تھا۔

منگل دیو خوشی سے یار بار ہاتھ ملاتے ہوئے رفی سے کہنے لگا ...... It is a gala day Then. آؤ بیٹھو! آج دونوں مل کر اسے celebrate کریں گے۔

کوئی بارہ بجے کے قریب، دونوں نشے میں اتنے دھت ہو چکے تھے کہ بڑے بڑے دیوی اور ملکی مسائل کو حل کرنے میں تیار ہو گئے تھے۔ گفتگو نہایت ہی سنجیدہ اور اعلیٰ سطح پر ہو رہی تھی۔

"میں کہتا ہوں۔" منگل دیو نے رفعت حسین کے چٹکی لے کر کہا "ہندو اور مسلمان میں کیا فرق ہے؟"

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔" رفعت منگل دیو کو بڑی گمبھیرتا سے سمجھانے لگا۔ "یہ سارا جھگڑا ایک دم غلط ہے۔ ورنہ تم خود سوچو! سدھا اور شہزادی میں کیا فرق ہے؟"

"کوئی فرق نہیں ہے۔" منگل دیو نے شہزادی کی ران پر زور سے ہاتھ مارا۔

"رفعت حسین اور منگل دیو میں کیا فرق ہے؟" رفعت حسین نے پھر پوچھا۔

"کوئی فرق نہیں!" منگلو نے دوسرا ہاتھ رفعت حسین کی ران پر مارا اور پھر خود بھی بول پڑا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "مندر اور مزار میں کیا فرق ہے؟"

"دونوں خدا کے گھر ہیں۔" رفی نے شراب کا آخری گھونٹ پی کر جام خالی کرتے ہوئے کہا۔ پھر سدھا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بولا۔

"آؤ ڈارلنگ چلیں۔ ان کو آرام کرنے دیں۔

کوئی چار بجے کے قریب منگل دیو اپنے بستر سے اٹھا۔ بغل میں سوئی ہوئی شہزادی کو جگایا۔ اپنا بٹوہ اس کے ہاتھ میں دے کر بولا "اس میں جتنی رقم ہے۔ سب نکال لو۔ صرف دس کا ایک نوٹ میرے لئے رہنے دو۔

" شہزادی نے بٹوہ کھول کر لیٹے لیٹے ہی اُسے اپنے سینے پر انڈیل دیا۔ بہت سے نوٹ نکلے۔ وہ سب اس نے گن کر سمیٹ لئے۔ پھر بے جھے اٹھا کر اور بڑی ادا سے منگل دیو کو دکھا کر واپس بٹوے میں ڈال دیا۔ اور بٹوہ منگل دیو کی طرف بڑھا دیا۔

" تم آرام سے سوتی رہو۔ جب جی چاہے جانا۔ منگل دیو نے اس سے کہا۔۔۔۔۔۔" سوزی کو تمہارا پتہ تو معلوم ہو گا۔؟"

شہزادی نے خوابیدہ نظروں سے اُس چندن کی مورتی کو دیکھا۔ جس کا نام منگل دیو تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے ہنس کر بڑی ادا سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

" اچھا میں جاتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ ایک آخری پیار۔۔۔۔۔

منگل اُس پر جھک گیا۔ شہزادی نے اپنے دونوں بازو اس کے گلے میں حمائل کر دیئے۔

سوا چار بجے منگل دیو عقبی لفٹ سے نیچے اترا۔ باہر امپالا کھڑی تھی۔ پیرامونٹ ہل پوائینٹ پر پہنچا۔ وہاں رولڈ زموبائیل کھڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر وہ روی شنکر کی پہلے سے بتائی ہوئی جگہ پر پہنچا۔ اکیلا ساحل۔ کالی کالی سیاہ چٹانیں اور قدموں میں چاندی کی جھالر کترتا ہوا کف آلود سمندر

منگل دیو ایک بڑے پتھر پر سادھی لگا کر سمندر کے کنارے بیٹھ گیا۔ اور شہزادی کے سیمیں بدن کے دھیان میں کھو گیا۔ صبح کے تازہ دم جھونکے شہزادی کی نرم و نازک الکلیوہ کے ریشمی لمس کی طرح اس کے جسم کو گدگداتے جاتے تھے۔ سمندر کی لہروں میں اس کے قدموں کا رقص تھا

۔۔۔۔۔۔۔۔ ہری اوم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہری ادم ۔۔۔ ۔۔

شری گنیش آئنمہ ۔۔۔۔۔

بھور ہونے لگی۔ افق کے خالی جام میں روشنی کے پہلے پیگ کا سنہرا پن جھلانے لگا۔ اور ایستادہ ناریل کے سبز چھتاروں میں خوش الحان طیور کے پہلے سر شہزادی کی ٹھنڈی ہنسی کی طرح گونجنے

لگے ۔ سیاہ چٹانوں سے پرے بل کھاتی ہوئی کالی سڑک نیلگوں
ہوتی گئی ، اور ان پر آنے والے جاتریوں کے ڈھول تاشوں کی آوازیں
سنائی دینے لگیں۔ مرد ، عورتیں ، بچے ، بوڑھے پوجا کا سامان لئے ،
رات بھر سے سمادھی لگائے مہنت منگل دیو کو جگانے کے لئے جوق ،
در جوق دور دور سے آرہے تھے۔ مقدس بھجنوں کی آوازیں قریب
آنے لگیں - چار گھوڑوں کی چاندی کی پالکی کا چھتر اور کلس دور سے چمک
رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے آہستہ سے منگل دیو نے اپنی آنکھیں ذرا سی کھول کر
ہلے جلے بغیر اپنی آنکھوں کے کونوں سے اس آنے والے ہجوم کو دیکھا پھر آنکھیں
بند کر کے گہرے دھیان میں ڈوب گیا۔

سینکڑوں لوگ تھے - ہزاروں لوگ - بھجن گاتے ہوئے - بھگتی کے
نشے میں سرشار لوگ - سچے لوگ - معصوم لوگ - غریب لوگ - اعتقاد اور
محبت میں ڈوبے ہوئے لوگ زور زور سے استتی کرتے ہوئے
قریب آرہے تھے - انہوں نے سمادھی میں مستغرق منگل دیو کو
اپنی باہوں میں اٹھا کر چاندی کی پالکی پر سوار کر دیا۔ مگر منگل دیو
کی سمادھی نہیں ٹوٹی - وہ اسی طرح چاندی کی پالکی پر آلتی پالتی مارے
اپنی سمادھی میں غرق رہا- بالعموم چاندی کے رتھ پر سوار کرتے سمے

منگل دیو کی سمادھی لوٹ جاتی تھی۔ آج جو نہیں لوٹی تو بھگت لوگوں کی شردھا سوگنا بڑھ گئی اور وہ زور زور سے مہنت منگل دیو کے جیکارے لگانے لگے۔

رات کو ردی شنکر نے منگل دیو کو بتایا آج جو جلوس نکلا ہے۔ وہ برسوں تک یاد رہے گا۔ آپ کی چاندی کی پالکی پر جو چڑھاوا چڑھا ہے۔ اس کی مالیت اٹھارہ ہزار سے زیادہ ہوگی۔ اٹھارہ ہزار کی نقدی ہے ........ زیورات اس کے علاوہ ہیں گرو دیو۔ ردی شنکر نے مہنت منگل دیو کے چرنوں کو چھو کر کہا۔ جیسے وہ کل کے کم چڑھاوے کی بھول سے معافی مانگ رہا ہو۔

منگل دیو نے خوش ہوکر، اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے آشیرباد دی۔ چڑھاوے میں سے پانسو روپئے نکال کر اسے انعام میں دیئے۔

اتنے میں پھر سوزی کا ٹیلیفون آیا۔

# چوتھا باب

جونہر نے ایلا کو گولڈ یاؤل بار میں کھانے کی دعوت دی تھی۔ ایلا ہلکے اودے رنگ کا فراک پہن کر آئی تھی۔ جو اس کی بنفشی آنکھوں کے ساتھ میچ کرتا تھا۔ جونہر نے بھی نیلی مچھلیوں والا ٹان لیش شرٹ پہن رکھا تھا، اور گہرے سبز رنگ کی ٹیری لین پتلون۔ اتنی تنگ کہ ذرا حرکت کرنے پر اس پتلون کے اندر سے اس کی رانوں کی مضبوط مچھلیاں حرکت کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ ایرک جونہر نے زرد پردوں والی کھڑکی کے نیچے اپنا ٹیبل ریزرو کرایا تھا۔ جہاں سے وہ بڈھے آئرلیش گٹار نیئے کو گٹار بجاتے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ایلا کو اپنے سامنے کی کرسی آفر کی۔ اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے کیمرے کے چرمی بکسے

کو اتارا اور اپنی اور ایلا کے بیچ کی کرسی پر رکھ دیا۔ ای کندھے پر دوسرے چھوٹے بیگ کو اتارا اور اپنے سامنے کے ٹیبل پر رکھ دیا۔ پھر کریم خاں ویٹر کو بلا کر اسے کوئین آف کوئینز وہسکی کا آرڈر دیا۔

"پوری بوتل ؟" ایلا نے حیرت سے پوچھا۔

"پوری بوتل !"

ایرک جونز نے کامل دلجمعی سے کہا۔

آج سے ٹھیک پندرہ دن پہلے ایرک کی جیب میں دس روپے بھی نہ تھے۔ کبھی نہ ہوتے تھے۔ ایلا، ایرک کو چھ سال سے جانتی تھی۔ وہ ایک لینڈ سکیپ فوٹوگرافر (Landscape) تھا۔ نینی تال میں پہلی بار وہ اُس سے ملی تھی۔ جہاں اس کا باس لے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کسی روحانی وجہ سے نہیں، محض اس وجہ سے کہ اس کا باس ایک درجن سے زیادہ کاروباری کمپنوں کا ڈائرکٹر تھا۔ اور اسے اپنے لئے ایک پرائیوٹ سکریٹری کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔

کہیں بھی وہ جائے۔ بزنس کو تو دیکھنا پڑے گا۔ ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک سے! ایلا کو ایرک سے عشق ہو چلا تھا۔ مگر ایرک بہت

غریب تھا۔ بہت خوددار تھا۔ بہت احمق تھا۔ اُسے لینڈ سکیپ فوٹوگرافی سے عشق تھا۔ مگر آج کل لینڈسکیپ کسے پسند آتے ہیں؟ مدھم مدھم رنگوں والے گلابی منظر۔ سفید بطخیں، جھیل کے پانی میں تیرتی ہوئیں۔ درخت، شاخیں کھوئے سفید بادلوں کو تکتے ہوئے۔ بھوری بھیڑیں ہری گھاس پر منہ مارتی ہوئیں۔ فاختہ کے بچے چوگے کے منتظر۔ ایرک ایک ناکام فوٹوگرافر تھا۔

چھ سال سے ایلا ایرک سے عشق کر رہی تھی۔ وہ اس کی بیوی بننا چاہتی تھی۔ اُس سے بچے چاہتی تھی۔ چھ سال سے وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

لمحہ بہ لمحہ اسکی جوانی گذرتی جا رہی تھی۔ جب عورت شہد ہوتی ہے۔ مہک ہوتی ہے۔ نشہ ہوتی ہے۔ جب خالی آئینے اس کا انتظار کرتے ہیں۔ اور نرم نرم ریشم اس کے خموں کو چھونے کے لئے بے قرار ہوتے ہیں۔ عورت کی جوانی وہ کچا موم ہے جو مرد کے اخلاق ہاتھوں میں سوز کر شمع بنتی ہے۔ چھ سال تک دھیرے دھیرے ایلا سسکتی اور سلگتی رہی۔ مگر شمع نہ بن سکی۔ کیونکہ ایرک ایرک غریب ہی رہا۔ وہ کبھی مشہور فوٹوگرافر نہ بن سکا کبھی کبھار اس کے دو تین لینڈسکیپ سال میں مختلف انگریزی ماہناموں میں

چھپ جاتے ۔ مگر اس کی جیب ہمیشہ خالی رہی۔ اور شادی کا دن دور سے دور ہوتا گیا ۔ آج سے پندرہ دن پہلے ایلا نے ایرک سے لڑائی مول لے لی تھی۔ پندرہ دن تک وہ دونوں ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے ۔ پندرہ دنوں کے بعد آج ملے تھے۔ وہ بھی ایرک کے بار بار ٹیلیفون کرنے پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ورنہ ایلا نے تو تہیہ کر لیا تھا ۔ کہ وہ ایرک سے اب کبھی نہیں ملے گی ۔ ملنا تو اُسے آج بھی نہ چاہیئے تھا ۔ مگر نہ جانے کیوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ شاید گذشتہ میٹھے لمحوں کی یاد اُسے کھینچ لائی۔ ورنہ قاعدے سے تو اُسے ایرک سے نہیں ملنا چاہیئے تھا ۔ ایرک خوشی سے اچھل رہا تھا ۔ زیر لب گنگنا رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ماسٹر کنگ کے مہنگے سگریٹ پی رہا تھا ۔ نہ صرف اس نے کوٹن آف کونٹنز کا آرڈر دیا تھا ۔ اس نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آج ایرک نے ایلا کیلئے بہترین سینک منگائے تھے ۔ اور پینے کے لئے مارٹینی ۔

مارٹینی ؟ ایلا حیرت سے چونک گئی۔ کیا تمہارا کوئی امیر چچا وفات پاگیا ہے ۔ یا تمہاری لینڈ سکیپ فوٹو گرافی کا البم بک گیا ہے ؟"

"ایک گالے نے دودھ دیا ہے ۔"

ایرک خوشی سے چہک کر بولا ۔

پھر اس نے میز پر رکھے ہوئے چھوٹے بیگ کا زپ کھولا اور ایلا کو اُس میں جھانکنے کی دعوت دی۔ ایلا آگے کو جھکی۔ حیرت سے چونک کر اس نے اپنا ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ پورا بیگ نوٹوں سے بھرا ہُوا تھا۔

"کوئی ڈاکہ ڈالا ہے۔؟" ایلا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایرک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کہہ تو رہا ہوں۔ ایک گائے نے دودھ دیا ہے۔"

"صاف صاف بات بتاؤ۔ پہلیاں نہ بجھاؤ۔" ایلا ذرا چمک کر بولی۔

"پہلے تم پینا شروع کرو"۔ ایرک نے مارٹینی کا یاقوتی جام اس کے آگے بڑھایا۔ خود وہسکی کا ایک گھونٹ لیا۔ مارٹینی کے یاقوت نے ایلا کے یاقوتی لبوں کو چھو لیا۔ ہری محراب والے آتشدان کے قریب بیٹھے ہوئے بڈھے آئرش گٹار یئے نے بھاری آواز میں گایا۔

دریا بہتا ہے

گنگا ہو کہ ڈینوب دریا بہتا ہے۔

ایرک بولا۔

"جب تم مجھ سے نہیں میری عزیزی سے لڑیں تو میں نے سوچا۔ میں

اس آرٹ کو بھول جاؤں، جو مجھے بھوکا رکھتا ہے۔ جو مجھے تم سے دور رکھتا ہے ـــــــ وہ بچے جو ہمیں خوابوں میں بلاتے ہیں۔ جب اس غریبی کی وجہ سے ہم سے قریب نہیں آسکتے تو اس فن کا بھول جانا ہی اچھا ہے۔ چند لمحوں کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ میں اپنے فن کو اسی طرح سطح پر لے آؤں جس سطح پر طوائف رقص اور نغمے کو لے آتی ہے۔ مگر میں نے سوچا کہ اگر مجھے اپنے مقدس فن کو اس سطح پر سے گرانا ہے تو میں سیدھا سیدھا خود ہی طوائف کیوں نہ ہو جاؤں؟ یا کسی چکلے میں نوکر ہو جاؤں؟ یہی سوچ کر میں سوزی کے یہاں چلا گیا۔"

"سوزی؟"

"ہاں۔ سوزی ایک اینگلو انڈین عورت ہے۔ اور بیرا ماؤنٹ ہل پر ایک ہائی کلاس چکلا چلاتی ہے۔ وہیں پر میں نے ویٹر کی ملازمت اختیار کر لی۔ تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ماہانہ۔ اوپر سے ٹپ میں بیس تیس روپے روز ہو جاتے تھے۔ سیدھا سادا دھندا تھا۔ مگر مزا نہ آیا۔ اس سطح پر اترنے کے بعد بھی اگر میں غریب ہی رہا تو کیا بات ہوئی۔ ایک روز مجھے شرارت سوجھی اور میں نے یہ کیا . . . . . . . . " اتنا کہہ کر ایک چپ ہو گیا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے بیگ کا ڈھکنا پھر سے کھولا اندر ہاتھ ڈال کر، بھرے ہوئے نوٹوں کے نیچے ٹٹول ٹٹول کر اس

نے ایک پیلے رنگ، کا لفافہ نکالا، اور اُسے کھول کر ساری تصویریں ایلا کے سامنے ڈھیر کر دیں۔

"دیکھو تو! میں نے کیا کیا؟"

ایلا دیکھنے لگی۔

مہنت منگل دیو اور شہزادی ......... سید رفعت حسین اور سُدھا ..... سُدھا اور مہنت منگل دیو، رفعت حسین اور شہزادی ننگی تصویریں،

"آئرش بڈھے کا گنگنا طنز آمیز سروں میں ہنستا معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ گا رہا تھا ؎

ہوس کے لمبے سایوں میں
خدا بھی تھک کر سوتا ہے
دریا بہتا ہے

دوسرے لمحے ایرک نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ....."میں ان تصویروں کو ڈویلپ کر کے سُوزی کے پاس لے گیا۔ کچھ کہا نہیں اُس سے۔ بس یہ ساری تصویریں اس کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ وہ بھی کچھ نہیں بولی۔ سمجھدار عورت ہے۔ اس نے چند لمحے چُپ رہنے کے بعد اور خاموشی سے میرا انچیوز سخت اور بے رحم چہرہ دیکھنے کے بعد دو جگہ ٹیلیفون

گئے۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد مہنت منگل دیو اور سید رفعت حسین دونوں میرے سامنے ٹیبل پر موجود تھے۔

تصویروں کو دیکھ دیکھ کر تقریباً غش کھا رہے تھے .....

ہمارے سوزی نے معاملہ سنبھالا۔ اور اکیس ہزار پہ فیصلہ ہوا۔ سات ہزار مہنت منگل دیو نے دیئے۔ سات ہزار سید رفعت حسین نے اور سات ہزار سوزی نے۔ کیونکہ یہ واقعہ اُس کے چکلے میں ہوا تھا۔ اس لئے اُس نے کہا۔ کہ وہ اس سزا میں برابر کی شریک رہے گی۔ بڑھی حرافہ بہت سمجھ دار ہے۔ اپنے گاہکوں کو اپنے چکلے میں رکھنے کے سب گُر جانتی ہے۔ یہ کل کا واقعہ ہے اور آج میں نے تمہیں ٹیلیفون کیا ہے ——— ایلا کے چہرے پر ایک درد کی لہر سی آئی۔ اس کا رنگ اُڑ گیا۔

"اب ہم شادی کر سکتے ہیں" ایرک نے اتنا کہہ۔ کہ جام خالی کر دیا "اور گھر لے سکتے ہیں" ایرک نے دوسرا پیگ بناتے ہوئے کہا۔ "اور اپنے سپنے پورے کر سکتے ہیں" اس نے دوسرا پیگ بھی اپنے گلے میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ایلا کے جام میں دوسری مارٹینی بناتے ہوئے کہا "ایلا تم خاموش کیوں ہو؟ جو تم چاہتی تھیں، وہ سب تو اب ہو گیا اور ایک دن میں ہو گیا۔ جس کام کو میں چھ سال میں نہ

کر سکا۔ اُسے میں نے ایک دن میں کر دکھایا ہے۔ مگر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ اپنے آپ پر نہیں۔ اس عہد کی تہذیب پر افسوس ہوتا ہے۔ جو رشوت کے لئے پیسے دے سکتی ہے۔ بلیک میل کے لئے پیسے دے سکتی ہے۔ جو چوری چکاری، قتل، ڈکیتی، بے ایمانی اور جعلسازی کو روا رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک آرٹسٹ کے ایمان دار فن کی قدر نہیں کر سکتی اس لئے آج سے میں نے لینڈسکیپ فوٹو گرافی کو خیرباد کہدیا ہے۔ آج سے میں وہی فوٹو گراف کروں گا۔ جو بازار میں بکتا ہے۔ قتل کی تصویریں...... وزیروں کی تصویریں........ حادثوں کی تصویریں... نیم عریاں عورتوں کی تصویریں........ فسادوں کی تصویریں...... گرتے ہوئے مکانوں۔ ٹکراتی ہوئی موٹروں اور رستے میں بھٹکتے ہوئے لوگوں کی تصویریں....... تصویریں جو بھڑکاتی ہیں چونکاتی ہیں اور وحشت زدہ کرتی ہیں............ جلدی جلدی ایرک نے ایک بڑا پیگ بنایا۔ ایلا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسکی طرف دیکھ رہی تھی۔

"چپ کیوں ہو؟" ایرک نے کسی قدر درشتی سے اُس سے پوچھا۔ "بولتی کیوں نہیں ہو؟"

"ایرک!" ایلا ہموار اور رُکتے ہوئے لہجے میں بولی۔ .....! "میری

شادی ہو چکی ہے "

"لو ۔۔۔!" ایرک گھبرا کر چلایا۔ جام اس کے ہاتھ سے چھلک گیا۔

"آہستہ سے ایلا نے اثبات میں سر ہلا یا۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" ایرک زور سے چیخی۔ اس قدر زور سے کہ آس پاس کی میزوں سے لوگوں کی نگاہیں اٹھ کر اس پر جم گئیں۔

"یہ مذاق نہیں ہے۔ حقیقت ہے" ایلا ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی ........" چھے سال میں نے تمہارا انتظار کیا۔ چھے سال میں تمہارے حالات بدلنے کی دعا کرتی رہی ........ اور اس دن جو تم سے لڑ کر گئی تھی، تو ہمیشہ کے لئے گئی تھی۔ میں نے موہن کمار سے شادی کر لی ہے۔ ہندو ہو چکی ہوں۔ موہن کمار کئی فلموں کا میوزک ڈائرکٹر ہے۔ اور برسوں سے میرے پیچھے پڑا تھا۔ میں اس سے پیار نہیں کرتی۔ مگر پیار ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ ایرک!؟ عورت گھر بھی چاہتی ہے اور بچے اور وہ عرصہ جس میں وہ تخلیق کر سکتی ہے، بہت کم ہوتا ہے۔ مرد تو ساری عمر تخلیق کر سکتا ہے لیکن فطرت نے عورت کو بہت کم وقت دیا ہے "

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟ تم ...... تم! ایرک نے بڑی سختی سے

ایلا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یاد کرو وہ شامیں، جب بارش برس کر ختم جاتی تھی اور تمہارا ہاتھ سرک کر میرے ہاتھ میں آجاتا تھا۔ اور میری زندگی کے سارے عزیب لمحے تمہاری انگلیوں کو چھو کر مکمل ہو جاتے تھے۔ تم کسی دوسرے کی کیسے ہو سکتی ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔؟ ایلا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایلا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!" ایرک نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

ایلا نے بے اختیار اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ بولی۔ "یسوع کی قسم! میں کسی دوسرے کی ہو چکی ہوں۔ آج سے چار روز پہلے میری موہن کمار سے شادی ہو گئی۔ قاعدے سے تو مجھے آج نہیں آنا چاہیئے تھا۔ مگر میں تمہیں بتا دینا چاہتی تھی۔"

لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!!" ایرک اپنی ٹیبل سے اٹھ کر اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر رہا تھا۔ غیض و غضب کی حالت میں اس نے پہلے تو اپنے جام کو اٹھا کے دیوار پر دے مارا۔ پھر میز پر پڑے ہوئے بیگ کو اٹھا کر جلدی سے کھولا اور کھول کر اس میں اپنے دونوں ہاتھ ڈال کر اور دونوں ہاتھوں میں کرنسی نوٹ بھر کر انہیں ہوا میں اچھالنے لگا۔ وہ بالکل پاگل ہو رہا تھا۔ اور پاگلوں کی طرح نوٹ اچھال اچھال کر

قہقہے لگاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

" لوٹو ! لوٹو !! مفت کا مال ہے !"

کرنسی نوٹ ہوا میں اڑ رہے تھے اور گولڈ باؤل میں بیٹھے ہوئے لوگ اپنی میزوں سے اٹھ اٹھ کر ان نوٹوں کو اپنے ہاتھوں سے پکڑنے کی کوشش میں ایک دوسرے پر پلے اور گرے جا رہے تھے۔ بار میں ایک ہڑبونگ سی مچ گئی۔ تین چار بار بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایرک نے نوٹوں کو ہوا میں اچھالا۔ آخر میں پورا بیگ چیختے چلاتے لوگوں کے سر پہ انڈیل دیا اور دوسرے ہاتھ سے بیچ کی کرسی پر رکھے ہوئے اپنے کیمرے کے چرمی بکس کو اٹھا کے تیزی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہڑبونگ کی جگہ خاموشی نے لے لی۔ لوگ کچھ ناکام کچھ بامراد واپس اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ بڈھے آرٹسٹ گٹار بجانے والے نے اس ہنگامے میں مطلق کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ جب سب لوگ واپس اپنی اپنی میزوں پر بیٹھ چکے تو وہ آہستہ سے مسکرایا۔ بڑی درشتی سے اس نے گٹار کے تاروں پر اپنا ہاتھ پھیرا اور بھاری آواز میں اپنا گیت ختم کیا۔

لفظ مر گئے۔

کون اس سناٹے میں کھڑا رو رہا ہے ؟"

اگلے چند لمحوں میں سب چپ تھے۔ صرف ایک میز پہ سے ایلا کی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔

فرش پہ سے ایرک کی گری ہوئی وہسکی کی بوتل اٹھاتے ہوئے کریم خاں ویٹر کے ہاتھ بھی دس کا ایک نوٹ آیا تھا۔ وہ اُس نوٹ کو اپنی جیب میں ڈال کر، اور بوتل کو اٹھا کر، جس میں تھوڑی سی وہسکی باقی رہ گئی تھی، بار کے اندر کیبن چلا گیا۔ وسکی کو جلدی سے اُس نے اپنے گلے میں انڈیل لیا۔ پھر جیب سے "مجھے" نکال کر دیکھا۔ تہیں کھول کر "مجھے" صاف کیا۔ پھر تہہ کر کے اپنے اندر کی جیب میں مجھے ڈالتے ہوئے، کریم خاں کے چہرے پر اطمینان کا ایک تبسم نمودار ہوا۔

کل وہ اپنی بچی کے اسکول کی فیس ادا کر سکے گا۔

# پانچواں باب

رات کو کریم خاں نے اپنی بیوی کو سارا قصہ سنایا۔ یوں تو گولڈ یا ڈل بار میں ہر روز کسی نہ کسی طرح کا دھما چوکڑی ہی رہتا تھا۔ مگر ایسا واقعہ کو کریم خاں کی بیس۲ برس کی ملازمت میں دیکھنے کو نہیں آیا تھا۔ گولڈ یا ڈل میں زیادہ تر پھٹے حال بیکار۔ پریس فوٹوگرافر۔ شاعر۔ گلوکار۔ مصور۔ اور اُن کے موڈل جمع رہتے تھے۔ اُن میں سے کچھ بال بڑے ہوتے تھے۔ سوکھی، دُبلی لڑکیاں سر پہ بیٹے جیسے بالوں کے گھونسلے بنا کر آتی تھیں، اور چرس کے سگریٹ پھونکتی تھیں۔ غیر ملکی جہازیوں اور سیاحوں کا بھی یہ اڈہ تھا۔ جو اس بار کے عجیب و غریب ماحول کی شہرت سن کر اُسے دیکھنے کے لئے چلے آتے تھے۔ غرض کہ ہر وقت

ایک عجیب طرح کا غل غپاڑہ رہتا تھا۔ مگر رات کا واقعہ تو اپنی نوعیت کے اعتبار سے لاجواب تھا۔ جب ایک سرپھرے فوٹوگرافر نے نوٹوں سے بھرا ہوا بیگ بار میں سب کے سروں پر الٹ دیا تھا۔ دوسرے روز ہر اخبار میں اسی واقعہ کا چرچا تھا۔ ایہ کمدنی اودھم مچا کر اخبار کے پہلے صفحے پر اپنی جگہ حاصل کر لی تھی۔ جہاں ہمیشہ وزیروں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ ہوائی جہازوں کے لڑنے اور ٹرینوں کے الٹنے کی خبریں ہوتی ہیں ........ خبریں صرف واقعات کی اوپری سطح پیش کرتی ہیں۔ اندر کیا ہوا ؟ کس طریقے سے اس نے یہ روپئے حاصل کئے ؟ اور کیوں پچھلے سال تک اسے یہ روپئے نہیں ملے ؟ اور صرف اسی وقت کیوں ملے ؟ جب اس نے اپنے فن کو غیر سماجی طریقے سے استعمال کیا۔ اور اس ایک بظاہر احمقانہ اور مضحک واقعے کے پیچھے کتنی بڑی ٹریجڈی پنہاں ہے ؟ کسے ان باتوں میں دلچسپی ہے ؟ انسان کی تہذیب میں ابھی تک اوپری سطحوں پر پھسلنے کی تہذیب ہے۔ کریم خاں کو بھی زیادہ دریافت کرنے کی لگن نہیں تھی۔ وہ محض اسی بات سے خوش تھا کہ اسے کسی طرح سے اپنی بیٹی کے لئے، اسکول کی فیس دینے کے لئے دس روپئے اچانک، اور بالکل مفت میں مل گئے تھے۔ اسکی آٹھ سالہ بچی مسرت جہاں بھی

بہت خوش تھی۔ اب فیس نہ دینے پر استانی کلاس روم میں اُس کا نام نہیں پکارے گی۔ اور اُسے اپنی سہیلیوں کے سامنے ذلیل نہیں ہونا پڑے گا۔

سفید شلوار کے اوپر ہرے رنگ کا فراک نما قمیض پہن کر، بستہ بغل میں داب کر، اپنی ماں سے بس کے آجانے کے لئے بیس۲ پیسے لے کر اور دیکھے، اپنی جیب میں احتیاط سے رکھ کر مسرت جہاں خوشی خوشی اسکول چلیں ........ بس کے اڈے سے اسکول تک کا فاصلہ دس منٹ کا تھا۔ مگر مسرت جہاں پیدل جانا پسند کرتی تھی۔ اس طرح سے وہ بس کے بیس۲ پیسے بچا لیتی تھی۔ اور اپنی سہیلیوں کے سنگت بھیل پوری کھا سکتی تھی۔ بس کے اڈے سے آگے گذر کے اُس نے ٹرنر روڈ کا ناکا کراس کیا، اور ممتاز علی پارک کا شارٹ کٹ اختیار کیا۔ ممتاز علی پارک کے بیچوں بیچ گذرتی ہوئی وہ نمبر دس شاہراہ پر آنکلی۔ جہاں پر صبح کے ٹریفک کی بہت بھیڑ تھی۔ اتفاق سے آج آٹو میٹک بتیاں بھی خراب تھیں اور چوک کا سنتری چوراہے سے دور ایک لاری اور ٹیکسی کے ایکسیڈنٹ کے سلسلے میں بہت مصروف تھا۔ اس لئے چوراہے پر اور بھی گڑبڑ پیدا ہو گئی تھی۔ بسوں کی لمبی قطاریں۔ دفتر کو بھاگتے والوں

بار بار بلا کر کہنے لگی۔

"میرا اسکول تو پیچھے رہ گیا ہے"

"گاڑی تیز کرو!"

ادھیڑ عمر کے آدمی نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

مسرت جہاں خوف سے دہشت زدہ ہو کر چیخ مارنے ہی کو تھی۔ مگر اس کے منہ پر ادھیڑ عمر کے آدمی نے اپنا مضبوط ہاتھ رکھ دیا تھا۔ کئی مرتبہ مسرت جہاں نے چیخنے کی کوشش کی۔ مگر اس کا منہ بند کا بند رہا۔ ادھیڑ عمر کے آدمی کا ہاتھ ایک آہنی ڈھکنے کی طرح اس پر پڑا تھا۔

اگلے ایک گھنٹے سے بھی زیادہ عرصے تک گاڑی مختلف پُر پیچ راستوں سے گذرتی رہی۔ اور بالآخر شہر کے باہر ایک چھوٹے سے سنسان مقام کے ایک پرانے بنگلے کے اندر پورچ میں چلی گئی۔ مسرت جہاں کو گاڑی سے نکال کر اندر کے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں ایک تنومند گھٹیلا آدمی بلو بلیک رنگ کی پتلون پر بھورے رنگ کی ایک خوشنما جرسی پہنے بیٹھا تھا۔

"لے آئے؟" اس نے مسرت جہاں کو دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں" ادھیڑ عمر کے آدمی نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

بھوری جرسی والے آدمی نے اُٹھ کر بڑے پیار سے مسرت جہاں کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بولا۔

"اسے کوکوکولا پلاؤ ۔ جو کھانے پینے کو مانگے اسے دو ۔ اسے کسی طرح کی تکلیف یہاں نہ ہونی چاہیئے۔ بڑی پیاری بچی ہے یہ۔ میں ابھی ٹیلیفون کر کے آتا ہوں۔"

مسرت جہاں خوف سے سسکنے لگی ......... "میں کوکوکولا نہیں پیوں گی ۔ میں گھر جاؤں گی ۔ اماں کے پاس۔"

"ہاں ہاں بچی ۔ تجھے اماں کے پاس بھیج دیں گے۔ بلکہ تیری ماں کو بھی یہیں بلا دیں گے"

بھوری جرسی والے آدمی نے اُسے پچکار کر کہا۔ "میں ابھی ٹیلیفون کر کے آتا ہوں۔"

بھوری جرسی والا آدمی باہر جا کے گاڑی میں بیٹھا۔ راستے میں دو تین ٹیلیفون بوتھ چھوڑتا ہوا۔ بالآخر ایک سنسان نکڑ کے پبلک ٹیلیفون بوتھ میں گھس کر ٹیلیفون کرنے لگا۔

۱۷۸۔۔۹

"ہیلو ........"

اُدھر سے آواز آئی۔

"حاجی مصطفیٰ کے گھر سے بول رہے ہیں؟" مجبوری جرسی والے نے پوچھا۔

"ہاں وہیں سے بول رہے ہیں۔ تم کون ہو؟"

"حاجی مصطفیٰ کو فون پر بھیجو!"

"وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔ کارخانے گئے ہیں۔ تم کون ہو؟"

"تو حاجی صاحب کی بیگم صاحب کو بھیجو۔!"

"میں حاجی صاحب کی بیگم صاحب بول رہی ہوں۔ تم کون ہو؟"

"میں بولتا ہوں۔ آپ کی بچی مسرت جہاں آج کیا اسکول نہیں گئی۔؟"

"اسکول تو گئی ہے"۔ بیگم صاحب نے گھبرا کر کہا۔ "کیوں؟"

"اسکول تو نہیں پہنچی"۔

اُدھر سے ایک ہیجانی کی آواز آئی۔ ........"اسکول نہیں پہنچی؟ کیا تم اسکول سے بول رہے ہو؟"

"نہیں میں اسکول سے نہیں بولتا۔ دوسری جگہ سے بول رہا ہوں۔ آپ کی بچی میرے پاس ہے ٹھیک ٹھاک ہے۔ زندہ ہے۔ خیریت ہے۔ —— سنو بیگم صاحب! کان کھول کر سنو۔!! آج شام کے چھے بجے کڈر پائینٹ کے سنسان ساحل پہ سمندر کے کنارے جدھر ناریل کے چار جھاڑ کھڑے ہیں۔ اس جگہ ایک بڑے کالے پتھر کے اوپر ×

ایکس کا مارک چاک سے لکھا ہوگا۔ اُس کالے پتھر کے نیچے آج شام کے چھے بجے پچیس ۲۵ ہزار روپئے رکھ دو۔ اس میں نوٹ بھی نہیں ہونے چاہئیں۔ دس کے یا دس ہی کے نیچے کے نوٹ ہونے چاہئیں۔ پولیس کو خبر نہیں کرنا۔ کسی کو ساتھ نہیں لانا۔ وہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ ہم سب کو معلوم رہتا ہے۔ آج شام کے چھے بجے ہم کو پچیس ۲۵ ہزار روپئے مل جائیں گے تو تم کو آج رات ہی کو تمہاری لڑکی واپس مل جائے گی۔ نہیں تو خلاص کر دی جائے گی۔"

بھوری جرسی والے نے ٹیلیفون رکھ دیا۔ جواب کا انتظار کئے بغیر بوتھ سے نکل کر اس نے بڑے اطمینان سے ایک سگریٹ جلایا اور واپس پیل کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بڑے اطمینان سے بنگلے میں پہنچا۔ جاتے ہی اس نے ادھیڑ عمر کے آدمی سے کہا۔

"چھے بجے کڈر پائنٹ پر پہنچ جانا۔ میں نے ٹیلیفون کر دیا ہے۔"

دن بھر مسرت جہاں اسی کمرے میں بیٹھی رہی۔ اگر اُسے پیاس لگی تو اُسے کوکو کولا دیا گیا۔ بھوک لگی تو عمدہ سے عمدہ کھانا کھلا دیا گیا۔ کھیلنے کے لئے اُسے گڑیاں اور کھلونے پیش کئے گئے۔ مسرت جہاں کا ڈر بہت کم ہو گیا تھا۔ مگر

پھر بھی وہ بار بار اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر مجھے ٹٹول لیتی تھی کہ میں خیریت سے موجود تو ہوں۔

کوئی ساڑھے سات بجے کے قریب، ادھیڑ عمر کا آدمی کڈر بائینٹ سے لوٹا۔ مایوسی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھتے ہی بھوری جرسی والے آدمی نے کہا۔

"حاجی نہیں آیا۔؟"

"کوئی نہیں آیا۔!"

بھوری جرسی والا آدمی عجیب پریشانی اور غصے کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مسرت جہاں اس کی غضبناک صورت دیکھ کر سہم گئی۔

"اب کیا کریں؟" ادھیڑ عمر کے آدمی نے پریشان ہو کر کہا۔

اور جیب سے ایک چاقو نکال کر بولا۔

"اس کو خلاص کریں ..........!"

اس نے مسرت جہاں کی طرف اشارہ کیا۔

چاقو کے ننگے پھل کو دیکھ کر مسرت جہاں کی گھگی بندھ گئی۔

"نہیں۔" بھوری جرسی والا غصے سے بولا ........ "ضرور کوئی مشٹیک ہے۔"

"تم جا کے حاجی کے باورچی سے معلوم کرو۔"

بہت رات گئے، ادھیڑ عمر کا آدمی واپس آیا۔ مسرت جہاں کو اُس وقت تک بھوری جرسی والے آدمی نے کھانا کھلا کے سلا دیا تھا۔ اور خود اس کے پلنگ کے پاس ایک کرسی پر بیٹھا۔ اونگھ رہا تھا۔ باہر پورچ میں گاڑی کی آواز سن کر چونک گیا۔

ادھیڑ عمر کے آدمی نے اندر آکر ہانپتے کانپتے کہا۔ . . . .

مسرت جہاں تو گھر میں ہے۔ حاجی کے گھر میں ہے۔ باہر پولیس کا پہرہ لگا ہے۔ میں تو اندر گیا نہیں۔ اتفاق سے باورچی کسی کام سے باہر نکلا تو میں نے بازار میں اس سے پوچھا۔

"کیا مسرت جہاں آج اسکول نہیں گئی؟"

"گئی تو تھی۔ اور تمہارے ٹیلیفون کرنے کے بعد بڑا ہلا مچا۔ خود حاجی اسکول گیا پولس لے کر۔ مگر مسرت جہاں اسکول میں موجود تھی۔ وہ اُسے لے کر گھر چلا گیا۔"

"تو پھر یہ لڑکی کون ہے؟"

مالوم نہیں۔"

وہ ادھیڑ عمر کا آدمی حیرت سے بولا۔

اس نے اپنا نام بھی مسرت جہاں بتایا تھا"

بھوری جرسی والے آدمی نے ایک تیز جھٹکے سے سوتی ہوئی مسرت جہاں کو جگا دیا۔

وہ گھبرا کر اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"لڑکی تیرا نام کیا ہے؟" بھوری جرسی والے نے اس سے بڑے کڑوے لہجے میں پوچھا۔

"مسرت جہاں"

"کیا تیرے سکول میں کوئی اور بھی مسرت جہاں پڑھتی ہے"

"وہ تو سیکشن بی میں ہے"

"کیا اس سے تیری صورت ملتی ہے"

"بہت ملتی ہے"

مسرت جہاں مسکرا کر بولی۔

"پر اس کا باپ تو حاجی مصطفیٰ ہے۔ اور وہ تو گنجا اور چیچک مارا ہے۔ میرا باپ تو کریم خاں ہے۔ اور وہ گول پول دگولڈ ماڈل میں ویٹر ہے"

مسرت جہاں نے بڑے فخر سے اعلان کیا۔

یکایک بھوری جرسی والا آدمی اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے

گھور کر ادھیڑ عمر کے آدمی کی طرف دیکھا۔ ادھیڑ عمر کا آدمی سہم کر پیچھے ہٹنے لگا۔ مگر اتنے میں بھوری جرسی والے آدمی نے اس کے منہ پر اتنے زور کا گھونسہ دیا کہ وہ کئی پٹخنیاں کھاتا ہوا فرش پر لوٹنے لگا۔ اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا۔

"سالا جو کام کرتا ہے کچا کرتا ہے۔" بھوری جرسی والے آدمی نے گرج کر کہا۔ "آج بیزی منسٹیک سے پچیس ہزار کا نقصان ہو گیا۔ گولی مارنے کو جی چاہتا ہے۔"

ادھیڑ عمر کا آدمی فرش پر گرا ہوا۔ اپنے ہونٹوں سے لہو پونچھ رہا تھا۔

رات کے دو بجے تک کریم خاں کے گھر میں کوئی نہ سویا تھا۔ کریم خاں کی بیوی دو پہتڑ مار مار کر رو رہی تھی۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اور آواز بیٹھ گئی تھی۔ ہمسائے کی دو بوڑھی عورتیں اسے دم دلاسہ دینے کی بے سود کوشش کر رہی تھیں۔ کریم خاں کے دونوں بچے

اپنی بہن کے لئے رو رہے تھے۔ یکایک دروازے پر دستک ہوئی کریم خاں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ پولس کا ایک سپاہی مسرت جہاں کو انگلی سے لگائے کھڑا تھا۔ مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"رام پیٹھا کے نالے پر مجھے یہ مل گئی۔ روتی ہوئی ادھر آ رہی تھی۔ پہلے میں اسے تھانے میں لے گیا۔ اس کا بیان دلوایا۔ اب اسے لے کے آیا ہوں۔ سنبھالو اپنی لڑکی کو۔"

وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ بیچ میں ہی خوشی کی چیخ مار کر کریم خاں کی بیوی نے مسرت جہاں کو گلے سے لگا لیا تھا۔ وہ اس کا منہ چومتی جاتی اور زور زور سے روتی جاتی تھی۔ دونوں ماں باپ . . . . . ہمسائے کی بوڑھی عورتیں، سب مسرت جہاں کے گرد جمع تھے۔ مسرت جہاں بڑے فخر سے کہہ رہی تھی۔

"اماں اماں - میں نے دس کا نوٹ بچا لیا۔ گُنڈوں کی نظر بچا کر شلوار کے نیفے میں اڑس لیا تھا۔

مسرت جہاں نے نیفے سے 'مچھے' نکال کے سب کو دکھایا۔

عین اسی وقت کریم خاں نے وہ نوٹ مسرت جہاں کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور پولس کے سنتری کو دے دیا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے سنتری صاحب۔ تم میری لڑکی کو صحیح سلامت گھر لے آئے۔"

سنتری نے مجھے تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھا۔ اور کریم خاں کو سلام کر کے گھر سے باہر نکل گیا۔

• • •

# چھٹا باب

اگلے دو دن پولیس سنتری اٹھوالے کی بیوی دمینتی نے مجھے ،
سنبھال کر رکھا۔ کیونکہ اُسے راشن لاتا تھا۔ مگر دس روپوں میں راشن
نہیں آ سکتا تھا کیونکہ اُس کے گھر میں کھانے والے دس افراد
تھے۔ اگلے روز اٹھوالے دو روپے لے کے آیا۔ اس سے اگلے روز
تین روپے۔ جب پندرہ روپے ہو گئے تو اٹھوالے کی بیوی دمینتی
ہرے رنگ کی نوگزی ساڑی جس کا کنارہ اودا تھا۔ پہن کر اور بالوں میں
دیتی سجا کر راشن کی دکان پر گئی۔ اور مجھے اور میرے چھوٹے
بھائیوں کو دے کر گھر کے لئے راشن لائی دمینتی نے ہمیں بلنگ میں داخل

کرا دیا۔ جہاں سے شام سکھانی ایک سندھی واچ مرچنٹ نے ۸۷۷ روپے کا ایک چیک بھنایا۔ اور نترا پنجی نے دوسرے نوٹوں کے ساتھ ہمیں بھی ان کے ہمراہ کر دیا۔ سندھی واچ مرچنٹ اپنی گاڑی بینک تک نہیں لا سکا تھا۔ کیونکہ اس سڑک پر نو انٹری کا بورڈ لگا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی چوک کے ایرانی کی دوکان کے سامنے کھڑی کر رکھی تھی۔ مگر ناکے سے گزرنے سے پہلے ہی فتو جیب کترے نے اس کی جیب کا صفایا کر دیا۔ اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر کے مرکز کی طرف روانہ ہو گیا۔ سستا مارکیٹ میں پہنچ کر اس نے ستّرہ روپے کی ایک ساری لی۔ اپنے لئے ایک نو روپے کی پتلون۔ اور سات روپے کی ایک شرٹ لی۔ رگھو پان والے سے کوکین والا اسپیشل پان کھایا۔ پھر ٹیکسی کو بٹاٹا والی چال میں دولت خان پٹھان کو ساٹھ روپے قرضے کے واپس کئے۔ پھر ٹیکسی پکڑی۔ گلشن آبادلین کی آٹھ نمبر چال میں واسنتی کی کھولی میں پہنچا۔ کب سے اس کی نظر واسنتی پر تھی۔ اور واسنتی بھی اس کی نظر پہچانتی تھی۔ مگر واسنتی بہت مہنگی لونڈیا تھی۔ حالانکہ ایک چال میں رہتی تھی مگر اس کے چھوٹے سے کمرے میں سب کچھ تھا . . . . . . ایک ریڈیو۔ ایک ریکارڈر۔ ایک ٹرانسسٹر بجلی کا پنکھا۔ فرش پر غالیچہ۔ پلنگ پر

قوم رہے۔ سب کچھ جو جوان خوب صورت۔ عزیب مگر بکاؤ واسنتوں کو بیس۲۰ یا بیس۲۲ کی عمر تک ملتا رہتا ہے۔

دن بھر وہ واسنتی کے ساتھ رہا۔ شام کو اُسے پکچر لے گیا۔ رات کو بھی وہیں رہا۔ دوسرے دن بھی وہیں رہا۔ شام کو اُسے سرکس دکھانے لے گیا۔ دوسری رات بھی وہیں رہا۔ تیسرے دن کی سہ پہر سے واسنتی کو کہیں جانا تھا۔ اس لئے دوپہر کا کھانا کھا کر وہ اس سے رخصت ہُوا۔ تینوں دن لگاتار پیتا رہا تھا۔ اور واسنتی کو بھی پلاتا رہا تھا۔ وہ دونوں تاش کھیلتے رہے تھے۔ اور واسنتی کو پاتے کی خوشی میں فتو برابر ہارتا گیا تھا۔ پھر بھی وہ سب کچھ دے دلا کر جب واسنتی کی کھولی سے نکلا تو اس کی جیب میں ساڑھے چھے سو سے کچھ اوپر کی رقم ہو گی گلشن آباد لین سے نکل کر اس نے پھر ٹیکسی کی۔ چیتھا بھائی کے جوئے خانے میں پہنچا، تاکہ واسنتی پر خرچ کی گئی رقم کو پورا کر سکے۔ مگر وہاں بیٹھے بیٹھے پچھتر روپے ہار گیا۔ نشہ بھی اترنے لگا تھا۔ گھر اور بیوی کی یاد ستانے لگی۔ اس نے ہاتھ روک لیا۔ اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔ پھر ستا مارکیٹ پہنچا۔ اپنی بیوی کے لئے اس نے تیرہ روپئے کی ایک ساری خریدی۔ چار روپئے کا ایک بلاوز باہر نکل کر رگھو پان والے سے کوکین کا اسپیشل پان کھایا۔ اور باسٹھ نمبر کی بس میں بیٹھ کر گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

بس میں وہ اوپر بیٹھا تھا ۔ اپر ڈیک پر۔ جہاں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آ رہے تھے۔ اور بس کے چاروں طرف گویا روشنیوں کے بنڈولے گھوم رہے تھے۔ ساری دنیا پر کیف و مستی کا عالم طاری تھا۔ وہ بار بار مسکرا کر اپنے ارد گرد بیٹھے والوں کو بڑے اطمینان اور شفقت سے دیکھ لیتا تھا، اور اُسے ایسا لگتا تھا، بس میں بیٹھے ہوئے سب آدمی مکمل طور پر خوش ہیں۔ ہر ایک نے کسی ایک دوسرے کی جیب کاٹی ہے۔ اور اب خوش و خرم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ ہوا کے مہکتے ہوئے جھونکوں میں اُسے نیند سی آنے لگی۔ دو راتوں سے وہ سویا نہیں تھا۔ نیم غنودگی کے عالم میں اُسے واسنتی کا جسم یاد آنے لگا۔ دودھیا۔ شفاف بجلی کا کرنٹ دیتا ہوا۔ کیوں نہ وہ پھر یہیں سے لوٹ جائے ؟ مگر واسنتی آج تو ملے گی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

یکایک وہ ایک جھٹکے سے چونک کر اٹھ بیٹھا۔ بس اس کے اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ جلدی سے وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھٹا کھٹ سیڑھیاں اترتے ہوئے بس کے نچلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف جاتے ہوئے پھول والے کی دکان پر رک گیا۔ اور اپنی بیوی ساجی کے لئے ایک وینی خریدنے لگا۔

دینی لے کر پیسے دینے کے لئے جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کا ہاتھ جیب سے باہر نکل گیا۔ صاف، بالکل صاف۔ پانچوں انگلیاں باہر۔ کسی نے بڑی مشاقی سے اس کی جیب کاٹ لی تھی۔

"پیسے پھر دیدوں گا" کہہ کر اس نے دینی ہاتھ میں اٹھا لی۔ دوڑ کر واپس بس کے اڈے پر گیا۔ دیر تک اِدھر اُدھر اپنے کسی بھائی بند کی ٹوہ میں رہا۔ مگر یہ تو اس کا اپنا علاقہ تھا۔ جہاں کوئی دوسرا جیب کترا کیسے پر مار سکتا تھا؟ جیب کترے ایک دوسرے کے علاقے کے سلسلے میں اتنے دیانتدار ہوتے ہیں۔ جتنے ملک اور قومیں بھی نہیں ہوتیں۔ کیا مجال کوئی جیب کترا کسی دوسرے کے علاقے میں گھس جائے۔ اگر جیب کترے ملکوں کے پرائم منسٹر بنا دیئے جائیں تو کبھی کوئی سرحدی جھگڑا نہ ہو۔

"پھر یہ کیسے ہو گیا؟"

سر جھکائے بھاری قدموں سے چلتا ہوا۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہوا وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا۔

دروازے پر ساجی اس کی منتظر تھی۔

"تیسرے دن آئے ہو تو کیا لائے ہو؟"

فتو نے اُسے ساری دی، بلاؤز دیا۔ دینی اس کی ہتھیلی

پر رکھدی۔

"بس" ساجی نے خفا ہو کے پوچھا۔

"تین دن میں یہی کمائی کی تم نے؟" ساجی نے تیز تر لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"کچھ مت پوچھ ساجی! لوگ بہت ہشیار ہو گئے ہیں۔ اپنی جیب کی اپنی جان سے زیادہ حفاظت کرتے ہیں۔" اُس نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

پھر اُس نے نگاہ اٹھا کر ساجی کی طرف دیکھا، اور پوچھا۔

"پولس کا کوئی بلاوا آیا تھا۔"

"ہاں پولس کا سنتری آیا تھا۔ میں نے کہا۔ وہ تو یہاں ہے نہیں۔ پوتا گیا ہوا ہے۔"

"بہت اچھا کیا۔"

"اور کہتی بھی کیا؟ یہ تو سب جانتے ہیں کہ جب جیب کترے کوئی بڑا مال اٹھاتے ہیں تو کئی کئی دن گھر نہیں آتے۔ مگر تم تو آج بھی تقریباً خالی ہاتھ آئے ہو؟" ساجی کے لہجے میں گہری شکایت تھی۔

فتو نے شرم سے سر جھکا لیا۔ آہستہ سے ساجی سے پوچھنے لگا۔

"اور تم نے کوئی دھندا کیا۔؟"

"دو دن تک تو کہیں کچھ نہیں ملا۔ آج شام کو باسٹھ نمبر کی بس میں ایک احمق سویا ہوا مل گیا تھا۔

فنو حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

ساجی نے فنو کی کاٹی ہوئی جیب، اپنی چولی سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اور شکایت بھرے لہجے میں بولی۔

"اسی لئے تو کہتی ہوں۔ جیب کاٹنے کے بعد کوئی نشہ نہ کیا کرو۔ سیدھے گھر آیا کرو!"

• • •

# ساتواں باب

فتو کے یہاں میں تقریباً ایک ماہ رہا۔ ہؤا یہ کہ ایک روز فتو "مجھے" لے کر جوا کھیلنے گیا۔ اور تین ۳ روپے جیت گیا۔ دوسرے دن پھر "مجھے" لے کر گیا، اور اٹھارہ روپے جیتا۔ اُس دن سے وہ سمجھنے لگا۔ کہ میں اُس کے لئے لکی ہوں۔ وہ ہمیشہ "مجھے" اندر کی جیب میں ڈالے پھرتا تھا۔ اور ایک تعویذ کی طرح کبھی اپنے سے جدا نہ کرتا تھا۔ کیونکہ اب وہ جوئے خانے میں زیادہ جانے لگا تھا۔ اس لئے اس کے دوسرے دوست بھی "مجھے" پہچاننے لگے تھے۔ "مجھے" جیب سے نکالتے ہی فتو کے ساتھیوں کا رنگ فق ہونے لگتا تھا۔ ایک بار تو گھسیٹے نے مجھ پر بولی لگا دی۔ فتو سے بولا۔

یہ دس کا نوٹ مجھے دے دے میں اس کے بیس دیتا ہوں۔"
ہوتے ہوتے بولی ساٹھ تک بڑھ گئی۔ مگر فتو نے مجھے نہیں بیچا۔
مسکرا کر تاں کر دی۔

"یہ تو میرا لکی نوٹ ہے۔" اس نے مجھے چوم کر کہا۔ "میرا یار ہے۔
آڑے وقت میں یہی تو کام آتا ہے۔ میں اسے کبھی اپنے سے جدا نہ کروں گا۔"

اس بیچ میں دو تین بار فتو پر بڑا سخت وقت آن پڑا۔ ایک بار تو
اسے اور ساتھی کو دو وقت بھوکا بھی رہنا پڑا۔ پھر بھی فتو نے مجھے نہیں بیچا۔
مگر ایک دن جب وہ چوالیسویں نمبر کی بس سے ایک پاکٹ مار کے اڈے پر
اتر رہا تھا کہ وشنو سنتری نے اس کی گردن ناپی اور اسے تھانے لے چلا۔
کچھ دور تک تو بھیڑ نے ان کا ساتھ دیا۔ پھر سب لوگ اپنے اپنے کام
سے چلے گئے۔ اور وہ دونوں اپنے آپ کو اکیلے پاکر ہمدانی کے چائے
خانے میں گھس گئے۔ وشنو نے دو کپ چائے کا آرڈر دیا۔ چائے پیتے
ہوئے وشنو نے فتو سے پوچھا۔

آج کتنی کمائی کی؟"
"کمائی کا آجکل زمانہ نہیں ہے۔ دو وقت کی روٹی بھی مل جائے
تو بس۔"

"جھوٹ بولتا ہے۔ دس دن سے تو نے مجھے ایک پیسہ نہیں دیا۔

اوپر سے جھوٹ بولتا ہے ؟"

فتو نے میز کے نیچے سے اپنی جیب سے ایک بٹوہ نکال کر وشنو کے ہاتھ میں تھمایا۔ رانہ داری سے بولا۔

" یقین نہ آئے۔ تو دیکھ لو۔ چار دن کے بعد ایک بٹوہ ملا ہے۔ اس میں بھی صرف ساڑھے چھے روپے نقدی ہے۔ ایک لوکل کا پاس تھرڈ کلاس کا۔ اور ایک ایمپلائمینٹ ایکسچیج کی چھٹی۔ کہ ابھی تمہارے لئے کوئی نوکری نہیں ملی۔ جب ملے گی۔ تو اطلاع دے دی۔ جائے گی۔ سالا ایسا ایسا تو دھندا ملتا ہے آجکل۔ اوپر سے تم اپنا بھتہ مانگتا ہے !"

" نہ مانگے تو چندہ کیسے رہے۔؟" وشنو چائے کا ایک بڑا گھونٹ پی کر بولا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر بیڑی سلگاتے ہوئے بولا " گھر والی کو کینسر ہے۔ ڈاکٹر بولتا ہے۔ دو سال میں مر جائے گی۔"

" تو کوئی دوسری چھوکری دیکھ کے رکھو"۔ فتو نے مشورہ دیا۔

' وہ تو دیکھ کے رکھی ہے۔" وشنو گہری اداسی سے بولا۔" پر جب تک گھر والی زندہ ہے۔ علاج تو کرنا مانگتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور آج مجھ کو اکیس ٢١ روپئے چاہئیں اس کی دوا کے لئے اور تو مجھ کو صرف ساڑھے چھے دیتا ہے۔ کاہے کو ایسی بے ایمانی کرتا ہے ؟"

"اور ایک کھوٹا پیسہ نہیں ہے میرے پاس ۔" فنتو گڑگڑانے لگا۔

" تو چل تھانے۔ تین دفعہ پہلے سجا کاٹ آیا ہے۔ اب کے ڈیڑھ دو سال کے لئے اندر جائے گا۔" دشنو نے گردن پکڑنے کے لئے پھر ہاتھ بڑھایا۔

" کیا کرتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟" فنتو گھبرا کر بولا۔ "ادھر سب دیکھتے ہیں۔ بے عزتی ہو جائے گی۔ نام نکل جائے گا۔"

" میں کیا کروں؟ سرکار کے حکم سے مجبور ہوں۔ تجھ کو پاکٹ مارتے پکڑا ہے۔ لے کے جاؤں گا۔"

فنتو بہت رویا، گڑگڑایا۔ مگر جیب دشنو کسی طرح سے نہیں مانا تو اُس نے جیب سے مجھے نکال کے ٹیبل کے اندر سے دشنو کے حوالے کیا۔ جیب کہیں جا کے دشنو نے اُسے چھوڑا۔

چائے ختم کر کے دشنو پائی اینڈ پائی ڈرگسٹ کی دوکان پر پہنچا اپنی گھر والی کے لئے اُس نے پندرہ روپئے کی دوا خریدی۔ مجھے ڈرگسٹ کے حوالے کیا۔ کاؤنٹر پر دشنو کے قریب پائپ پیتا ہوا ایک ادھیڑ عمر کا امیر آدمی کھڑا تھا۔ اس کے قریب ایک نوجوان نیپالن کھڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ شہر میں نئی نئی آئی ہے۔ پہاڑوں کی صباحت ابھی اس کے رخساروں سے اڑی نہیں تھی ........... کچھ خوش بھی

کچھ خوفزدہ بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معلوم ہوتا تھا ۔ اتنی بڑی دوکان ہیں پہلی مرتبہ آئی ہے ۔ حیرت سے ہر چیز کو دیکھ رہی تھی ۔ سیٹھ نے اس کے لئے عطر خریدا ۔ صابن ۔ چولی ۔ یوڈی کلون ۔ اور ایک لپ اسٹک ۔ سو کا نوٹ نکالا ۔ کاؤنٹر کے سیلز مین نے چھٹے میں ۷ مجھے ، بھی اسس کے حوالے کر دیا ۔ سیٹھ اور نیپالن دونوں باہر موٹر میں بیٹھتے نیپالن ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتے اور چھوتے ہوئے پوچھنے لگی ۔

" یہ کیا ہے ؟"

" سینٹ ہے ۔ بدن پر لگاؤ گی تو کھاٹ منڈو کے پھول بھول جاؤ گی ۔"

" یہ کیا ہے ؟"

" یوڈی کلون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے بدن ٹھنڈا ہوتا ہے !"

" یہ کیا ہے ؟"

" لپ اسٹک ، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہونٹوں پہ لگاتے ہیں ۔"

" کیسے ؟"

" جہاں جا رہے ہیں ، وہاں خود تیرے ہونٹوں پہ لگا کے بتاؤں گا ۔" سیٹھ نے نیپالن کے ہونٹوں کی طرف دیکھ کے کہا ۔ جس کے بوتٹ لپ اسٹک کے

بغیر ہی گلاب کی پنکھڑی تھے۔

نیپالن کے جسم میں ایک تھرتھری سی آئی۔ بولی!۔

"میرے گوُرکھے کو معلوم ہو گیا تو تیرے ٹھوکری مار دے گا۔"

"وہ کیا مارے گا۔" سیٹھ زور سے ہنسا: "وہ خود میرے ہاتھ سے چاندی کی ٹھوکری کھا چکا ہے۔"

"کیا؟" حیرت زدہ ہو کر نوجوان نیپالن نے سیٹھ کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں! اُسے سب معلوم ہے۔"

کچھ دیر تو نیپالن چپ رہی پھر دھیرے دھیرے رونے لگی۔ جیسے اس کا جسم ہی نہیں بکا ہو۔ اس کے دیس کے پہاڑ، وادیاں، گلاب؛ پھول، کھیت سب بک گئے ہوں کاغذ کا ایک پرزہ ماؤنٹ!! ایورلیسٹ پر گرا اور دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ دنیا کی سب سے گہری دلدل میں گر پڑا۔ اور لاوا پھٹ رہا تھا۔ چٹانیں اڑ رہی تھیں ........ موٹر دوڑ رہی تھی۔ اور نیپالن رو رہی تھی۔

کچھ دور آگے جا کر سیٹھ نے گاڑی رکوا دی۔ نیپالن نے آنسو پونچھ کر پوچھا۔

"انہوں نے ؟"

"نہیں!" سیٹھ بولا۔ پھر اس نے اپنے ڈرائیور کو چالیس روپے دے کر کہا۔

"بچھے بوتلیں بیئر کی لے آؤ۔"

"بیر؟" نیپالن نے پوچھا۔ "بیر تو ہمارے کھاٹ منڈو میں بہت اچھے ہوتے ہیں۔"

"بیر نہیں۔ بیئر!" سیٹھ نے ہنس کر کہا۔

"بیئر کیا ہے؟"

"ایک طرح کا شربت ہوتا ہے۔ آج تجھے چکھاؤں گا۔"

"سربت؟ آہا جی۔ سربت تو میں ضرور پیوں گی۔"

بے وقوف نیپالن تالی بجا کر بولی۔ اب وہ اپنے آنسو بھی بھول گئی تھی۔

کاؤنٹر پر پیسے چکا کر اُس بھولی نیپالن کو لے کر سیٹھ کہیں چلا گیا۔ اور میں وائن مرچنٹ کے کاؤنٹر سے ایک کھدر دھاری گاہک کی جیب میں آ گیا۔ جس نے ہوائی اڈے کی طرف جاتے ہوئے اس دوکان پر سے ایک وہسکی کا ادھا خریدا تھا۔ ادھے کو چاندی کے فلاسک میں الٹ کر اور اپنی جیکٹ کے اندر کی جیب میں

چھپا کر وہ کھدر دھاری ہوائی اڈے سے نئی دلی جانے والے ہوائی جہاز میں سوار ہوا۔ راستے میں وہ ٹائیلٹ میں جا کر چاندی کا فلاسک بار بار اپنے ہونٹوں سے لگاتا تھا۔ اور پھر باہر آجاتا تھا۔

دوسرے دن اس نے رام لیلا گراؤنڈ کے بھرے جلسے میں پرہیشن کے حق میں ایک شاندار تقریر کی۔ اس جلسے میں اس کی تقریر سب سے اچھی رہی۔ ایسی شاندار۔ جامع اور جوشیلی تقریر تھی اور اخلاق کی ایسی اعلیٰ سطح تک پہنچتی تھی کہ خود پرائم منسٹر نے جو اس جلسے میں موجود تھے۔ اس کھدر دھاری مقرر کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ اور یوں یہ بھی ایک لمحے کے لئے اپنے ملک کے پرائم منسٹر کے گلے سے لگ گیا۔ اُس روز سوموار تھا۔ اور ملک کے غذائی بحران کے پیش نظر ہر سوموار کو وہ کھدر دھاری فاقہ کرتا تھا۔ چنانچہ گھر جانے کی بجائے اس کھدر دھاری نے جلسے کے بعد سیدھا دریا گنج کا رخ کیا۔ وسکی کا اولادھا خریدا اور چاچے دے ہوٹل میں آ کے اس نے ایک مسلم تندوری مرغ کا آرڈر دیا۔ یہاں سے یہ بمبئی آیا۔ جو ابھی رات ڈیڑھ دن ایکس پریس سے بمبئی آرہا تھا۔ جہاں اوپیرا ہاؤس کے قریب اس کی دو دو دکانیں موٹر پارٹس کی تھیں۔

اسٹیشن سے اتر کر امراؤ سنگھ سردار نے ایک ٹیکسی لی۔ گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کا چھوٹا لڑکا جو آٹھویں میں پڑھتا تھا۔ اچانک ہیضے سے انتقال کر گیا ہے۔ گھر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ دو تارئیں سردار کو دلی میں دی جا چکی تھیں۔ مگر وہ اس وقت تو سفر میں تھا وہ لوگ اب لڑکے کی لاش شمشان گھاٹ لے جانے والے تھے۔ کہ امراؤ سنگھ عین موقع پر پہنچ گیا۔ اور روتا پیٹتا اپنے بچے کے جنازے میں شریک ہوا۔ شمشان گھاٹ پہنچ کر انہوں نے لڑکے کی لاش کو لکڑیوں کے ڈھیر میں رکھا اور میں شمشان کے مہتمم کی جیب میں پہنچ گیا۔ لڑکے کی لاش جل رہی تھی اور میں مہتمم کے جیب میں محفوظ تھا۔ کیونکہ انسان سب کچھ جلا دیتے ہیں۔ ......لاشیں۔ کتابیں۔ گھر۔ دوکانیں۔ امیدیں۔ مسرتیں۔ بسیں، ریل گاڑی سب جلا دیتے ہیں۔ مگر نہیں جلاتے ہیں تو کرنسی نوٹ کو آج تک کسی انسان نے کسی کرنسی نوٹ کو نہیں جلایا ہے۔

رات میں مہتمم کی بیوی کو اپنے کسی رشتے دار کی شادی میں شریک ہونا تھا۔ جانا تو مہتمم کو بھی تھا۔ مگر عین وقت پر پانچ لاشیں جلنے کے لئے آ گئیں اور وہ کام چھوڑ کر نہ جا سکا۔ اور اس نے اپنے بیوی بچوں کو شادی کے گھر روانہ کر دیا۔

شادی کے گھر میں کیسی رونق تھی۔ جھم جھماتے ہوئے ریشمی کپڑے۔ زرتار کی ساڑھیاں۔ رنگین قہقہے۔ کھلے ہوئے چہرے۔ محبت کے مہکتے ہوئے گیت اور خوشی سے دھوم مچاتے ہوئے چنچل بچے۔ منہ دکھائی کی رسم ہو رہی تھی۔ مہتمم کی بیوی نے دلہن کا گلابی گھونگھٹ ذرا سا اٹھا کر اس کا شرمایا ہوا چہرہ دیکھا اور اس کے مہندی بھرے ہاتھوں میں "مجھے" رکھ دیا۔

کئی دنوں تک میں دلہن کے معطر اور مطلا پرس میں پڑا رہا۔ کیونکہ دلہن کو کون پیسے خرچ کرنے دیتا تھا۔؟ دن میں دو تین بار وہ پرس کھلتا دو نازک حسین انگلیاں پرس میں داخل ہوتیں اور جیبی آئینہ نکال لیتیں۔ سب کی نظروں سے بچ کر دلہن اپنا چہرہ دیکھ لیتی، اور کھلے ہوئے پرس کے اندر سے ہمیں بھی اس کے چہرے کی ایک جھلک مل جاتی۔ دوسرے لمحے میں دلہن خود ہی اپنے حسن سے شرما کر جلدی سے آئینہ واپس پرس میں رکھ دیتی۔ اور کھٹاک سے پرس

کا بٹن بند ہو جاتا۔

پھر جب سب لوگ چلے گئے اور لجیا اور سریش کا دو کمروں والا فلیٹ جہیز کے فرنیچر سے بھر گیا۔ جب سریش کی چھٹی ختم ہو گئی، اور وہ پہلی بار اپنی بیوی کا منہ چوم کر آفس گیا تو لجیا نے ڈرتے ڈرتے، مجھے اپنے پرس سے نکالا۔ عجیب سہمی سہمی سی خوشی تھی، اس کے چہرے پر ........ آج اس کا گھر والا دفتر گیا تھا۔ آج پہلی بار وہ اپنے گھر میں اکیلی ہے۔ سب رشتے دار جا چکے ہیں۔ اور اب وہ اس فلیٹ کی مالکن ہے۔ آج پہلی بار وہ اپنے شوہر کے لئے کھانا تیار کرے گی۔

مجھے، تپائی پر رکھ کر اور میرے اوپر چاندی کی ٹرے والی رکھ کر دلہن سنگھار میز کے سامنے ایک پنسل اور ایک چھوٹا سا پیڈ لے کر بیٹھ گئی۔ اور مینو تیار کرنے لگی۔ آگے آنے مینو زبانی تیار کئے جائیں گے۔ اور شاید کئی کئی دنوں تک ایک ہی مینو چلے گا۔ مگر آج تو اس کا پہلا مینو ہے۔ اور لجیا منہ میں پنسل لے کر سوچ رہی ہے کہ وہ سریش کے لئے کیا تیار کرے؟ گاجر کا حلوہ کہ انڈے کا حلوہ؟ کھانے کا مینو تیار کرنے سے پہلے ہی وہ میٹھے کا مینو تیار کرنے لگی تھی کہ میٹھا اُسے بہت پسند تھا۔ تو پھر کیا ہو؟ گاجر کا حلوہ کہ انڈے کا حلوہ؟ کہ دونوں؟ ...... ہاں دونوں۔ اور اُسے سریش کی ماں نے بتا دیا تھا کہ سریش کو چنے کی

دال میں کترے ہوئے کریلے بہت پسند ہیں۔ بہت مشکل بھاجی ہے۔ مگر وہ اُسے بنانا جانتی ہے۔ ہاں دہ دہی بڑے بھی بنائے گی۔ اور ایسے خستہ اور نرم کہ مُسز لیشی حیرت سے انگلیاں چاٹتا رہ جائے گا۔ ساتھ میں مولی کے پراٹھے بھی ہوں گے۔ اور شملہ مرچ کا قورمہ نہیں نہیں۔ یہ زیادہ ہو جائے گا۔ وہ زیادہ بھی خرچ کرنا نہیں چاہتی تھی اور کم بھی نہیں۔ ایسا لگے۔ کہ دعوت ہو رہی ہے۔ اور ایسا بھی لگے کہ دعوت نہ ہوتے ہوئے بھی روزمرہ کے کھانے میں دعوت کا مزہ آجائے اور خرچ بھی دس روپوں سے زیادہ نہ ہو۔ حالانکہ دس روپے بہت ہیں مگر۔ آج تو اس کا پہلا کھانا ہے۔ آج دلہن پہلی بار اپنے گھر میں اپنے گھر میں کھانا تیار کر رہی ہے ........ کئی بار اُس نے پیڈ کے کاغذ پر مینو بنایا اور اُسے پینسل سے کاٹ ڈالا۔ آخر میں جب بھاجی والی نے باہر سے تیسری بار پکارا "بی بی جی تو کیا بھاجی نہیں لو گی۔؟" تو جلدی جلدی سے بجیاؔ نے ایک منٹ میں سب فیصلہ کر ڈالا۔ اس نے خوب اچھی طرح سے دیکھ دیکھ کے سب سبزیاں تھوڑی تھوڑی تلوائیں۔ شملہ مرچ اور مولی اور گوبھی اور گاجریں۔ ہری مرچیں اور دھنیا ادرک اور پیاز۔ کرم کلا اور مٹر زات کے لئے۔

بھاجی والی نے سب تول کے کہا۔ ساٹھ روپئے تو آنے

ہوئے ۔بی بی جی ہوتے تو آٹھ روپے تو آتے ہیں ۔ پر آج
تم سے ایک روپیہ نہ لوں گی ۔ آج تم پہلی دفعہ کھانا بنا رہی ہو۔
ٹھنڈی ٹھنڈی بسو سدا سہاگن رہو بہو!"

ممتا بھری بوڑھی بھاجی والی نے دل سے نئی دلہن کو دعا دی اور
دعا دیتے ہوئے اسے چالیس برس پہلے اپنی رخصتی کا دن یاد آگیا اور
اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ ببیا بوڑھی غریب بھاجی والی کے چرنوں میں
جھک گئی۔ بھاجی والی نے اسے ایک لمحے کے لئے اپنے گلے سے
لگا لیا! اور جب وہ ٹوکری اٹھا کر چلنے لگی تو ببیا گھبرا کر کہنے لگی۔
۔۔۔۔۔۔ٹھہرو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور بھاگی بھاگی اندر گئی اور
چاندی کی سرمے دانی کے نیچے سے اٹھا کے "مجھے" لے آئی ، اور
شرما کر اس نے "مجھے" بھاجی والی کے ہاتھ میں دے دیا۔ کچھ اس
طرح سے دے دیا ۔ جیسے وہ بھاجی والی کو ایک پھول پیش کر رہی
ہو۔ ورنہ لوگ تو آج کل یوں دس کا نوٹ پھینکتے ہیں ۔ جیسے وہ دوسرے
کے منہ پر جوتا مار رہے ہوں ۔ مگر کیسی نرمی اور انکساری تھی اس
دینے میں کتنی پاکیزگی کیسی شرم شاید اس لمحے میں میں نوٹ نہیں
تھا۔ ایک لڑکیا ہتا کا شکرانہ تھا۔ یوں تو اب تک ہزاروں
ہاتھوں سے میں گذرا ہوں اور آگے بھی گذروں گا ۔ مگر میں شاید

کبھی اس پاکیزہ لمس کو نہیں بھول سکوں گا۔ جب ایک دلہن نے مجھے کپکپاتے ہاتھوں سے اس نئے بھاجی والی کے سپرد کیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری آوارہ گرد زندگی کی ساری غلاظتیں دھول گئی ہیں۔۔۔ اور میں نے پھر سے جنم لیا ہے۔

# آٹھواں باب

شام کو گھر جاتے سمے بھاجی والی نے اگرسین بنئے سے مٹی کے تیل کی ایک بوتل خریدی اور مجھے اس کے حوالے کر دیا۔ بنئے نے دوکان بند کر کے گھر جانے کی بجائے ترپتی کے گھر کی راہ لی۔ ترپتی کو اگرسین ہر مہینے ڈیڑھ سو روپئے دیتا تھا۔ اور ڈیڑھ سو روپئے اس کا دوست شانتی لال دیتا تھا۔ شانتی لال بھی ایک بنیا تھا۔ اور اسی بازار میں تیس چالیس دوکانیں چھوڑ کر اس کی دوکان تھی۔ اگرسین اور شانتی لال کی دوستی عجیب طرح کی دوستی تھی۔ دونوں نے مل کر ایک داشتہ رکھی تھی۔ اور ہفتے کے دن بانٹ لئے تھے۔ دونوں مل کر کبھی کبھار ٹھیکہ لیتے۔ کبھی کبھار الگ ہو کر ایک دوسرے کے مقابلے پر آ جاتے ایک دوسرے کو کاٹنے کی کوشش کرتے۔ کبھی ایک جیت جاتا۔ کبھی دوسرا۔ کبھی دشمنی ہو جاتی۔ کبھی دوستی۔ اور یہ رشتہ دار محبت اور نفرت کے جوار بھاٹا کی طرح ڈولتا رہتا تھا۔

آجکل اگر سین شانتی لال سے کچھ زیادہ ہی خفا تھا۔ شانتی لال نے ملٹری کو گھی سپلائی کرنے کے لئے پونے دو لاکھ کی بولی دے کر ٹھیکہ حاصل کر لیا تھا۔ جو دو لاکھ کی عوض میں اگر سین کے پاس تھا۔ اور چار سال سے اس کا ٹینڈر منظور ہو رہا تھا۔ پچیس ہزار گھٹا کے شانتی لال لے گیا۔ اگر سین کی پیٹھ میں خنجر مارا تھا۔ طرح طرح سے اگر سین اس وار کو بھولنے کی کوشش کرتا، مگر شانتی لال کی طرف سے اس کا دل صاف نہ ہوتا تھا۔ اس لئے جب وہ ترپتی کے گھر پہنچا اور اس نے شانتی لال کو پہلے سے وہاں بیٹھا ہوا پایا۔ اور ترپتی اور اس کی دس سالہ بہن سونا کے ساتھ پتے کھیلتے دیکھا، تو اس کا غصہ اور بھی بھڑک گیا۔

گرج کر بولا:۔

"آج تو میری باری ہے۔!"

"نہیں میری باری ہے!" شانتی لال نے بڑے اطمینان سے چلتے ہوئے کہا:۔

"تم جھوٹ بولتے ہو!"

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔" شانتی لال ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ دھیرج سے بولا "تمہاری باری تو کل تھی۔ پوچھ لو ترپتی سے"

ترپتی کے لئے بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ ایک کو خوش کرتی ہے تو دوسرا ہاتھ سے جاتا ہے۔ دوسرے کو خوش کرتی ہے۔ تو پہلا خفا ہو جاتا ہے۔ مگر اب وہ اس مشکل کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ شانتی لال نے زور سے اپنے ہاتھ میں دبا لیا تھا۔ اسلئے وہ اپنا ہاتھ ہٹائے بغیر اگرسین کی طرف جھک کر بولی۔

" اگرو! تم واقعی کل آنے والے تھے۔ میں نے بہت دیر تک تمہارا انتظار کیا۔ کل تو میں نے تمہارے لئے کھویا ڈال کر کھیر بنائی تھی۔ مگر تم آئے ہی نہیں۔ اتنا کہہ کر ترپتی نے ایک طرف تو اگرسین کے گال سے اپنا گال لگا دیا۔ اور دوسری طرف شانتی لال کی ہتھیلی پر زور سے چٹکی بھری۔ گویا اُس سے کہہ رہی ہو۔ دیکھو تو اسے کیسا بنا رہی ہوں۔

اگرسین ترپتی کے گال کا لمس پا کر کچھ خوش ہُوا۔ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

" کل تو رام نومی تھی۔ میں کیسے آتا۔ ؟ تمہیں تو معلوم ہے تیوہار کے دن گھر والی مجھے کہیں نہیں جانے دیتی ؟"

" مجھے کیا معلوم ۔!" ترپتی نے اٹھلا کر کہا " اپنے یہاں تو روز تیوہار رہتا ہے۔"

شانتی لال ہنس کر بولا۔" چھوڑو نہ اس ٹنٹے کو بیٹھ کر دو گھنٹے ہمارے سنگ پتے کھیلو۔ کل آ جانا!"

"ہاں کونسی میں بھاگی جا رہی ہوں"۔ ترپتی نے یکایک اگرسین سے الگ ہو کر اپنا بدن چراتے ہوئے کہا۔ اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں بار بار جھپک جھپک کر اگرسین کی طرف بڑی ادا سے دیکھنے لگی۔

شانتی لال نے ٹھرے کی دوسری بوتل منگائی، اور چاروں تاش کھیلنے لگے۔ ایک آنہ پائنٹ ........ تاش کھیلتے کھیلتے اگرسین ہارنے لگا۔ اُس پر شانتی لال نے مسکرا کر یہ خبر دی کہ اس نے ملٹری کو اناج سپلائی کرنے کا ٹھیکہ ڈھائی لاکھ روپے میں حاصل کر لیا ہے۔ اُس پر اگرسین بھونچکا رہ گیا۔ چند لمحے خاموشی سے شانتی لال کو تاکتا رہا۔ پھر پسے پھینک کر بولا۔

"یہ خبر کہ ٹھیکہ خالی ہے۔ میں نے تم کو سب سے پہلے دی تھی۔ اور اسی روز یہ بھی فیصلہ ہوا تھا کہ ہم دونوں مل کر اس کا ٹینڈر بھریں گے"۔

"تو اس کے بعد تم نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی"۔ شانتی لال نے جواب دیا"۔ تو میں سمجھا تمہارا ارادہ بدل گیا ہے۔ اس لئے میں نے الگ سے ٹینڈر داغ دیا۔

"مگر تم نے تو خود کہا تھا کہ سات دن میں سوچ کر بتاؤں گا"۔

"کہا ہوگا۔ میں بھول گیا ہوں گا۔ شانتی لال بھی کسی قدر گرم ہوکر بولا:"ایسی کون سی بات ہے۔ اس میں مرچیں لگنے کی؟ ٹینڈر تو کھلے ہی رہتے ہیں تم اگلے سال ٹینڈر بھر دینا۔

ٹینڈر تو اگرسین نے بھی بھرا تھا۔ اور شانتی لال کو نہیں بتایا تھا۔ وہ دراصل شانتی لال کو ساجھے داری میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اور خود اپنا ٹینڈر اکیلے منظور کروا لینا چاہتا تھا۔ مگر یہاں پر بھی شانتی نے اسے مات دے دی۔ غصہ تو اسے بڑا آیا۔ مگر کیا کرتا؟ دانت پیس کر رہ گیا۔ بولا۔

"میں گھر جاتا ہوں۔ بولو کتنا ہارا میں؟

"اکیس روپئے" شانتی نے اسے بتایا۔

"اکیس روپئے نہیں۔ گیارہ روپئے ہوتے ہیں" اگرسین بولا۔

"نہیں اکیس روپئے حساب کرلو" شانتی لال بولا۔

"حساب کیا کردوں؟ مجھے سب یاد ہے۔ یہ لو اپنے گیارہ روپئے۔"

"گیارہ روپئے نہیں اکیس روپئے ہوتے ہیں۔ چاہو تو حساب کرو"

"حساب کروں گا اب میں تمہارے ایسے بے ایمان سے؟ جو دوست ہو کے دھوکا دیتا ہے..... " اتنا کہہ کر اگرسین نے دھجے، اپنے تھڑے سے

نکالا اور شانتی لال کی طرف پھینک کر بولا" میں تو تھوکتا بھی نہیں تمہارے
ایسے گندے حساب پر ۔!"

یکایک شانتی لال بڑا فروختہ ہو کے اٹھ کھڑا ہوا ۔ اس کا منہ غصے سے
اور بھی کالا پڑ گیا تھا ...... تم نے مجھے بے ایمان کہا ! ؟ مجھ پر تھوکتے
ہو !! ؟ مجھ پر تھوکتے ہو !! ؟ تو میں تمہارے اس دس روپے کے نوٹ پر
پیشاب کرتا ہوں "

اتنا کہہ کر شانتی لال اسی کمرے کے ایک کونے میں گیا ! اور دھوتی کی
ایک لانگھ کھول کر، سب کی طرف پیٹھ کر کے اس نے مجھ پہ پیشاب
کر دیا ......... پھر اٹھ کر اس نے اگر سین کی طرف اشارہ کر کے
بڑی شیخی سے کہا ۔

" وہ پڑا ہے تمہارا دس روپے کا نوٹ ۔ جب جی چاہے
اٹھا لینا "

اگر سین نے اکدم وہ کرسی اٹھالی جس پہ وہ بیٹھا ہوا تھا ۔ مگر تریتی
نے آگے بڑھ کر کرسی اس کے ہاتھ سے چھین لی ...... کیا کرتے ہو ؟
..... وہ غصے سے پیلا کر لیتی ۔

" میرے گھر میں کوئی دنگا نہیں ہوگا ۔! یہ شریفوں کا محلہ ہے ۔ میں ایک
شریف عورت ہوں ۔ کیا تم چاہتے ہو میرے گھر میں پولس آئے ۔ ہے مجھے پکڑ کر لے

، جائے ؟ اور تم دونوں کو بھی ۔ ؟"

" پولیس کا نام سنتے ہی اگر سین کچھ ٹھنڈا پڑا ۔ تر پتی نے اس کی کمر سے پٹ کر اُسے اور بھی ٹھنڈا کیا ۔ واپس اسی کرسی پر بٹھایا۔ شانتی کو گھورا۔ ڈانٹا۔ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر باتھ روم میں لے گئی ۔ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اُسے لیمو پانی پلایا۔ کیونکہ شانتی لال ٹھرے کی ایک پوری بوتل ختم کر چکا تھا۔ اور اب اگر سین کے ساتھ دوسری بوتل پی رہا تھا۔ ہاتھ روم سے نکال کر وہ اُسے بیڈ روم میں لے گئی ۔ اور اُسے اپنے بستر پر سلا دیا۔ جہاں سے چند منٹ کے بعد اس کے شرابی خراٹوں کی آواز آنے لگی ۔

اگر سین نے اوپر سے اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا۔ مگر اندر سے اُس کا خون ابھی تک کھول رہا تھا۔ کئی بار وہ گھر جانے کے لئے تیار ہوا ۔ مگر ترپتی اور سونا نے اسے گھر جانے نہ دیا۔ ترپتی کے اشارے پر سونا اگر سین کی گود میں بیٹھ گئی ۔ اور اس کے گلے میں باتھ ڈال کر بولی ۔

"چاچا مجھے ایک نیا فراک لیدو "

"شانتی لال سے کہو!" اگر سین نے فی الفور جواب دیا۔ ابھی اُسکی خفگی دور نہیں ہوئی تھی ۔

"وہ نہیں سے کر دیتے۔" سونا اگر سین کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی..... "بڑے کنجوس ہیں۔"

اگر سین سونا کی غیبت سے خوش ہو گیا۔ سونا کا کنوارا، چھریرا اور پتلا جسم اُس کے سینے سے لگا تھا۔ یہ جسم جو چار پانچ سال بعد پوری عورت کی طرح بھر جائے گا۔ دیکھنے سے لگتا ہے کہ سونا جوان ہو کر ترپتی سے بھی خوبصورت نکلے گی۔ اگر سین نے بیس روپے نکالے اور سونا کو دے کر بولا:

"وہ سالا کیا دے گا۔ دھوکے باز لو، فراک لے لینا۔"

سونا نے بیس روپے جیب میں ڈال کر بڑی ہوشیاری سے اپنی بڑی بہن ترپتی کو آنکھ ماری۔ اچھل کر اگر سین کی گود سے اتر گئی۔ اور اگر سین کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر بولی۔

"میرے ساتھ دس بازی کھیلو۔ صرف دس بازی۔"

"کھیلنے کی شرطیں مقرر کرو۔" اگر سین نے کہا۔

"اگر تم ہارے تو جو تم ہاروگے، میں تم سے لے لوں گی۔"

"بہت خوب۔" اگر سین ہنس کر پوچھنے لگا۔ "اور اگر میں جیت گیا تو۔"

"تو جو تم جیتوگے وہ میں سے لوں گی۔" ترپتی نے اس کے قریب

کر، اُس کے کان کے قریب ایک ٹھنڈی آہ بھر کے کہا۔

"یعنی چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی؟" اگر سین کھل کر ہنسا۔ اس کا سارا غصہ دور ہو گیا۔ پتے پھینٹتے ہوئے بولا۔

چلئے، صاحب ہمیں یہ دونوں شرطیں منظور ہیں۔"

اگلی دس بازیوں میں وہ بارہ روپئے جیت گیا ...... یعنی ہار گیا۔

اُسی نے بارہ روپئے نکال کے ترپتی کو دیدیئے۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر آیا۔ میں اب سوکھ گیا تھا۔ اُس نے اپنی دو انگلیوں کے ناخنوں کی مدد سے مجھے اٹھا لیا، اور بولا۔

"یہ دھن تو لکشمی ہے۔ اس کی ایسی بے عزتی میں برداشت نہیں کر سکتا"

اتنا کہہ کر وہ مجھے باتھ روم میں لے گیا۔ اور ٹونٹی کھول کر پانی سے مجھے بڑی احتیاط سے دھونے لگا۔

"لاؤ میں اسے استری کر دیتی ہوں" ترپتی بولی۔ ابھی خشک ہو جائے گا۔"

ایک کپڑا میرے اوپر رکھ کر ترپتی نے گرم گرم لوہے سے استری کی تھوڑی دیر میں، میں ایک خشک صاف ستھرے کڑکڑے نوٹ کی طرح اگر سین کی جیب میں تھا۔ اگر سین نے "چلئے" "چلئے" ترپتی سے کہا۔

"تم کل سے اس کمبخت کا یہاں آنا جانا بند کردو۔ تمہیں تین سو روپئے میں اکیلا دے دیا کروں گا۔"

"کل تم آ۔ رہے ہو نا؟" ترپتی بڑے پیار سے اس کی کنپٹی کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ "کل بات کرلیں گے۔"

"بہت اچھا کہہ کر اگر سین وہاں سے رخصت ہوا لیکن رات بھر اُسے نیند نہیں آئی۔ دوسرے دن جب وہ دکان بند کر کے ترپتی کے گھر جانے والا تھا۔ اس کی دوکان پر شانتی لال کا اس کے لئے فون آیا۔

"ہیلو؟"

"ہیلو، اگر سین بھائی۔" دوسری طرف شانتی لال بڑی شگفتی سے بول رہا ہوں۔

"ایسا ہے۔ میں نے آج سے ترپتی کو چار سو روپئے مہینے پر رکھ لیا ہے۔ آج سے تم وہاں نہ جانا۔ سمجھے میرے بھائی۔؟" شانتی بول رہا تھا۔

اگر سین کا خون کھولنے لگا۔ اس نے کچھ کہے بغیر ٹیلیفون بند کر دیا۔ دیر تک غصے میں ٹہلتا رہا۔ بڑبڑاتا رہا۔ دانت کٹکٹاتا رہا۔ آخر دوکان بند کر کے بنسی دادا کے اڈے پر چلا گیا۔ بنسی دادا اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"سیٹھ تم خود کیوں آئے۔ کسی کو بھیج کر مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"کام ہی ایسا تھا۔"

"حکم کرو!"

"اکیلے میں بات کروں گا۔"

"بتسی دادا کے ایک اشارے پر اس کے چیلے چانٹے کافور ہو گئے۔ اگرسین نے جیب سے بٹوہ نکالا۔ بتسی دادا کو دکھا کر بولا۔

"شانتی لال کو خلاص کرنا مانگتا۔ بولو کیا لے گا۔؟"

بتسی ایک لمحے کے لئے بھونچکا رہ گیا۔ چپ چاپ اگرسین کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"کام نہیں کرنے کا ہو تو بولو۔!"

"نہیں نہیں۔ کام کیوں نہیں کرنے کا؟ دادا جلدی سے بولا۔ ۔ ۔ ۔ کام کے لئے تو ادھر بیٹھا ہے۔

"تم بولو تو؟"

"ہزار میں خلاص کرے گا۔"

اگرسین نے بٹوہ کھول کر آٹھ سو کے نوٹ نکالے۔ سب دس دس کے نوٹ کیونکہ سو کے نوٹ دینے میں پہچان کا خطرہ تھا۔

بنسی دادا نے نوٹ لینے سے انکار کر دیا۔ ایسا ہے سیٹھ۔ یہ کام ہم کسی دوسرے اڈے والے سے کرائے گا۔ لوکل اڈے والے کو تو پولس سب سے پہلے پکڑے گا۔ اسلئے اپنے اڈے سے یہ کام نہیں کرائے گا۔ اس کے لئے بہت پیسہ دینا پڑے گا۔ ہزار سے کم میں نہیں ہو گا۔ ہم جاستی نہیں مانگتا ہے۔ اس کام میں ایک پیسہ پرافٹ نہیں ملیں گا۔ اپنے کو جو بھاڑ تم سے طے کرے گا۔ اس بھاڑ پر ہم شانتی لال کو آگے اٹھا دے گا۔ اپنے کو ایک پیسہ ملنے والا نہیں ہے۔ اس دھندے میں۔

اگرسین نے دو سو کے نوٹ گن کر اور دے دیئے۔ یوں اب بنسی دادا کی جیب میں تھا۔ جب اگرسین چلا گیا۔ تو بنسی دادا نے اپنے لفٹیننٹ صفدر خاں کو بلایا۔ اور اُسے چھ سو کے نوٹ دے کر سب معاملہ سمجھایا۔

" تم جوگیشوری اڈے کے کرتار سنگھ کے سپرد کر دو یہ معاملہ" بنسی دادا بولا " ہم نے ایک آدمی اس کے کہنے پر خلاص کیا تھا۔ اس پہ ہمارا ایک کھون واجب ہے۔ اس کو بولو اس کے بدلے میں شانتی لال کو خلاص کرے۔"

" نہیں دادا " صفدر خاں بولا " یہ بڑا معاملہ ہے۔ کرتار سنگھ مفت میں نہیں کرے گا۔"

" ہم کہاں مفت کی بات کرتا ہے ؟ اچھے سو تم

کو دیا نہیں ہے کیا؟ کرتار سنگھ سے بات کر لو۔ ہم آج رات کو پونا جاتا ہے۔ دو دن کے بعد لوٹے گا۔ اتنے میں تم اس کو خلاص کر دیا'

"اچھا دادا۔"

جب بنسی دادا اپنی Ahilila پکی کرنے کے لئے پونا چلا گیا تو صفدر خان نے اس چھے سو میں سے تین سو کے نوٹ گن کر کرتار سنگھ جوگیشوری والے دادا کو دیئے۔ اور اس سے معاملہ پکا کر لیا۔ اب یہ صفدر خان کی جیب سے نکل کر کرتار سنگھ کی جیب میں آ چکا تھا۔ کرتار سنگھ نے اپنے اڈے پر پہنچ کر اپنے سب سے قابل اعتماد لفٹینٹ چمکو سے مشورہ کیا۔ اُسے پچاس روپے دیئے۔ اور خود ڈھائی سو روپے لے کر لوناوے چلا گیا۔

چمکو نے بدلو کو بلایا۔ بدلو پستہ قد۔ پھولی ہوئی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا دس گیارہ سال کا لڑکا تھا۔ جسم سے لگتا تھا کہ جب سے پیدا ہوا ہے۔ فاقے کرتا آیا ہے۔ سانولا، دبلا، خشک ٹھنٹھ، گردن ذرا آگے کو بڑھا کے اور جھکا کے چلتا تھا۔ اور چلتے وقت اس کا سر ایک پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے بدن کی خشک ڈالی پر بار بار ہلتا تھا۔ لگتا تھا۔ ابھی کسی تیز و تند ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ کر گر جائے گا۔ اس

ماں ایک نیم پاگل اندھی بڈھی تھی۔ اور اُسکا باپ پھانسی پا چکا تھا قتل کے ایک چھوٹے مقدمے میں پھنس کر۔ اس کی دو بہنیں تھیں۔ ایک کی عمر سات سال کی تھی۔ دوسری کی پانچ سال کی۔ یعنی دونوں کی عمر اس قدر کم تھی کہ وہ ابھی فارس روڈ پر خود سے دھندا بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لیے گھر میں سب سے بڑا بدلو تھا۔ اور وہی روز کما کے لاتا تھا۔ وہ ایک گہری، تاریک، زنگ آلود بدبودار دنیا میں رہتا تھا۔ جہاں روشنی اچانک اور غیر متوقع طور پر، بجلی کی چمک کی طرح داخل ہوتی تھی۔ اور چند لمحوں بعد اس کی دنیا کو پہلے سے زیادہ تاریک اور مایوس چھوڑ جاتی تھی۔ اور کسی دوسری دنیا سے وہ واقف نہ تھا۔ بھکارنیں۔ طوائفیں۔ دلال۔ جیب کترے۔ اسمگلر۔ خفیہ بھٹی پر شراب بنانے والے۔ تالے توڑنے والے۔ سر توڑنے والے۔ موٹریں چرانے والے۔ ٹائر اڑانے والے۔ چرس، بھنگ۔ کوکین، افیم اور اس کے زہریلے مرکبات بیچنے والے ........ وہ کسی سمت کا اندازہ کئے بغیر لمحہ بہ لمحہ چلتے جاتا تھا۔ اور کسی نہ کسی طرح اپنی ماں اور دو بہنوں کا پیٹ پالتا جاتا تھا۔ اور اس کے آگے وہ کچھ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ایک خوفناک زہریلی دلدل کا پیلا غبارہ اس کے چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔

شاید اس کے باپ نے اس کا نام بادل رکھا ہوگا۔ مگر

وہ بادل جو کبھی برس نہ سکا۔ اسی لئے بدلو ہو گیا۔ اور جب حالات اور بدلے تو اس کا نام "چھو" ہو گیا۔ شکل و صورت سے اب وہ ایک انسان نما چھچھوندر دکھائی دیتا تھا۔ چمکو اُسے صرف چھو کہتا تھا۔ کیونکہ چھچھوندر کہتے ہیں بہت وقت لگتا ہے۔ اتنے عرصے میں تو کسی کا بٹوہ صاف کیا جا سکتا ہے۔

"—— کائے چھو؟" چمکو بدلو کو ایک عرصے سے چاقو چلانے کی تربیت دے رہا تھا۔

"بدلو کچھ نہیں بولا۔" سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔

"بڑا دھندا کرے گا؟"

بدلو کی آنکھیں لالچ میں چمکنے لگیں۔ غنڈوں کی اصطلاح میں صرف ایک بڑا دھندا ہے ...... قتل ...... باقی سب چھوٹے دھندے ہیں۔ اور جس دنیا میں بدلو رہتا تھا، اس دنیا میں قاتل سے بڑا معزز آدمی کسی دوسرے کو نہیں سمجھا جاتا۔ دادا کا جو گنڈا ایک بار کامیاب خون کر کے آ جائے۔ اس کی اڈے پر وہ عزت ہوتی ہے کہ پرم ویر چکر حاصل کرنے والے کو بھی کیا ہوتی ہو گی۔

"پورا دس روپیہ ملے گا۔"

بدلو خوشی سے چونک گیا۔ اب تک دن میں بھاگ دوڑ کر کے بڑی مشکل سے

روپیہ سوا روپیہ ہوتا تھا۔ کبھی دس بارہ آنے ہی۔ کبھی فاقہ بھی۔ آج پورے دس روپئے ملیں گے۔

بدلو کے چہرے پر ایسی چمک آئی، جو کسی نیک سے نیک کام کرنے والے کے چہرے پر بھی آجکل نہیں دکھائی دیتی۔

"چاقو ہے تیرے پاس؟" چمکو نے پوچھا۔ بدلو نے جواب میں چاقو نکالا۔

"تو آجا میدان میں۔!" چمکو نے بھی اپنا چاقو نکالا "آج تیری ٹھائی لیتا ہوں۔"

اگلے پندرہ بیس منٹ میں شاگرد اور استاد جم کے لڑے چمکو نے بڑھ بڑھ کے حملے کئے۔ مگر بدلو نے ہر وار خالی کر دیا۔ اور موقع پاکر چمکو کے سینے کو اپنے چاقو سے چھو لیا۔ چمکو نے اپنے چاقو کا پھل تہہ کر کے چاقو واپس جیب میں ڈال دیا۔ بدلو کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لڑائی میں تم ٹھیک رہا۔ پر اب اصل موقع پر کیسا کام کرتا ہے تو وہ دیکھنے کا ہے۔ چل میرے ساتھ۔

چمکو نے بدلو کو تلسی کا گھر دکھایا۔ شانتی لال کا گھر بھی دکھا دیا۔ وہ راستہ بھی بتا دیا۔ جس راستے سے شانتی لال رات کے بارہ ایک دو بجے تلسی کے گھر

سے نکل کر پیدل چلتا ہوا۔ اپنے گھر جا تا تھا۔ پندرہ منٹ کا راستہ تھا۔ انہیں پندرہ منٹ میں بدلو کو شانتی لال کو خلاص کرنا تھا۔ سب کام سمجھ کے اور مجھے بدلو کے حوالے کر کے اور باقی چالیس روپئے اپنی جیب میں رکھ کے چمکو وہاں سے چلا گیا۔

اُس رات کوئی تین بجے کا عمل ہوگا۔ جب شانتی لال تلسی کے گھر سے نکلا۔ وہ بہت خوش تھا۔ دو بڑے کاروباری دھندوں میں اس نے اگر سین کو شکست دی تھی۔، اور اب تلسی کے معاملے میں تو گویا اس نے اگر سین کی ناک بھی کاٹ ڈالی تھی۔ رات ایک نرم خوشگوار غلاف کی طرح اس کے ارد گرد لپٹی جا رہی تھی۔ اور وہ ایک فلمی گیت گنگناتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے بدلو دبکا ہوا آ رہا تھا۔

کئی تنگ و تاریک گلیاں پار کر کے شانتی لال ایک کھلی سڑک پر آ گیا۔ یہاں دو رویہ چھوٹے چھوٹے بنگلوں کی قطاریں شروع ہو گئی تھیں۔ ایک طرف آم کے گھنے پیڑ تھے۔ دوسری طرف کارپوریشن والوں نے پائپ بچھانے کے لئے ایک بہت بڑی موری کھود رکھی تھی۔ ابھی تک اس میں پائپ نہیں بچھا تھا۔

دھیرے دھیرے بدلو اپنے اور شانتی لال کے درمیان کا فاصلہ کم کرتا جا رہا تھا۔ کیونکہ قتل کے لئے یہی موزوں جگہ تھی۔

یکایک شانتی لال رک گیا۔ بدلو فوراً ایک آم کے پیڑ کے تنے کے پیچھے دُبک گیا۔

شانتی لال نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سڑک پہ سناٹا تھا۔ رات خاموش تھی۔ شانتی لال نے فلمی گیت گنگناتے ہوئے اپنی دھوتی کا لانگھ کھولا۔ اور سڑک کے کنارے سڑک کی طرف پیٹھ کرکے، کارپوریشن والوں کی کھودی ہوئی گہری موری میں پیشاب کرنے لگا۔

بدلو کو ایسا لگا۔ جیسے خود شانتی لال اپنے قتل میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ اس سے بہترین موقع دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔ بجلی کی سی تیزی سے بدلو آم کے پیڑ کے پیچھے سے نکلا اور سڑک کراس کرتے ہوئے چاقو کا پھل کھولتے ہوئے، شانتی لال کی طرف بڑھا۔ گہرے اضطراب کے عالم میں۔ بدلو نے آگے بڑھتے ہوئے سڑک کے کنارے ایک پتھر کو نہ دیکھا۔ اس سے وہ ٹھوکر کھا گیا۔ آہٹ پا کر شانتی لال نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ مگر پیشتر اس کے کہ اُس کے منہ سے کوئی آواز نکل سکے۔، بدلو اس پر کود گیا؛ اور دونوں پائپ سے خالی گہری موری میں جا گرے دو تین وار میں بدلو نے شانتی لال کو ختم کر دیا۔

جلدی جلدی بدلو موری سے باہر نکلا۔ جیب کو تھپتھپایا۔ دس کا نوٹ غائب تھا۔ شاید اس جھپٹ میں کہیں گر گیا تھا۔ یا شاید موری کے اندر جو کشمکش ہوئی تھی۔ اس میں کہیں گر پڑا ہو گا۔ بدلو پھر موری میں اتر گیا۔ جلدی جلدی اندھیرے میں ادھر اُدھر ہاتھ مار کر اُسے تلاش کرنے لگا۔ بار بار اس کے ہاتھ میں مٹی روڑے کنکر آ جاتے۔ ایک بار اس کا ہاتھ شانتی کے خون سے بھیگ گیا۔ جلدی سے بدلو نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ یکایک اُس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ میرا دس کا نوٹ . . . . . ؟ میرا دس کا نوٹ . . ؟ وہ سسک سسک کر اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ایسے گھٹے گھٹے کرب آمیز لہجے میں رو رہا تھا۔ جیسے لڑکے میٹرک کے امتحان میں فیل ہو کر روتے ہیں۔

دور سے سڑک پر کسی موٹر کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ بدلو کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ شانتی لال کی لاش سے لگ کر دبک گیا۔ اور جب موٹر گذر گئی۔ اس کے بعد بھی کئی منٹ اسی لاش سے لگ کر دبک کر تقریباً بے سدھ پڑا رہا۔ اس کے بعد سارے جسم میں خوف کی پھریریاں آ رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے اوسان بجا کئے۔ موری سے باہر نکلا اور باہر نکلتے ہی سرپٹ بھاگا۔ سرپٹ بھاگتا ہی گیا۔ سمندر کی طرف سمندر کے کنارے پہنچ کر بھی وہ نہیں رکا۔ وہ کپڑوں سمیت سمندر میں گھس گیا۔ اور

جب اسکے سارے کپڑے گیلے ہو گئے۔ اور سمندر نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تو اُسے اطمینان سا محسوس ہُوا۔ دیر تک وہ پانی میں گھسا رہا۔ پھر باہر نکل کر سنسان ساحل کی ریت پر اوندھے منہ لیٹ کر ہانپنے لگا۔

رات کی سردی اور سناٹے میں شانتی لال کی لاش موری کی خشک مٹی پر پڑی پڑی ٹھٹھرنے لگی تھی۔ میں موری سے باہر سڑک کے کنارے آم کے پیڑ کی ایک باہر نکلی ہوئی اور مڑی ہوئی جڑ میں لٹکا تھا۔ اور نیچے موری میں شانتی لال کی لاش کو اوندھا پڑا دیکھ سکتا تھا۔

ہولے ہولے رات کا اندھیرا دور ہوتا گیا۔ سمندر سے آنے والی ہوا تیز چلنے لگی۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے 'مجھے' وہاں سے اڑا دیا میں نے ہوا میں زقند بھری۔ کئی پٹخنیاں کھائیں۔ ہوا کے تیز جھونکے اور تھپیڑے 'مجھے' اپنے دوش پر تیراتے ہوئے شہر کی تنگ گلیوں کی طرف لے چلے۔ جدھر سے شانتی لال آیا تھا۔ اور جدھر اب وہ کبھی نہ جا سکے گا۔

یکا یک میں پہلی گلی کے موڑ پر ایک بڈھے بھکاری کی گود میں جا گرا جس نے صبحدم اکادکا راہ گیروں کو چلتے دیکھ کر اپنی مخصوص آواز میں بلکنا شروع کر دیا۔

بڈھے بھکاری نے چونک کر مجھے دیکھا نگاہ اٹھا کر آس پاس چاروں طرف دیکھا۔ کوئی راہ گیر اس کے قریب نہ آیا تھا۔ پھر یہ دس کا نوٹ کدھر سے آیا۔

کانپتی ہوئی نظروں سے جب اُس نے مجھے پہچان لیا تو بڈھے بھکاری کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بھگتی بھرے لہجے میں کہا۔

ہے بھگوان تو بڑا دیالو ہے!

. . .

# نواں باب

کوئی اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ سب اسے لکڑ بابا کہتے تھے۔ لکڑ بابا کنڈا گام کا رہنے والا تھا۔ جب وہ کنڈا گام میں تین مرتبہ میٹرک میں فیل ہو چکا تو گھر سے بھاگ کر بمبئی چلا آیا۔ بمبئی آکر اس نے ہر طرح کے پاپڑ بیلے، مگر کہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اور جب فاقوں پر فاقے لگنے شروع ہوئے تو اس نے ہار مان لی اور فقیر بن گیا۔

آج سے بیس برس پہلے تندراڈں کے غاروں کی جاترا کرتے کرتے اسے لکڑی کا ایک بت ملا تھا۔ صرف سر چہرہ، گردن اور بائیں شانے کا ایک حصہ موجود تھا۔ باقی سارا جسم غائب تھا۔ اس لکڑی کے بت کا چہرہ بے حد خوفناک مگر عجیب طریقے سے دلکش تھا۔ کہ دیکھنے والی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ

لپٹا تھا۔ سر پر جٹا۔ ماتھے پر تیوریاں۔ بڑی بڑی پھیلی ہوئی۔ آنکھیں اور کھلے ہوئے ہونٹ جن کے اندر ہاتھی دانت کے دانت لگے ہوئے تھے۔ گردن پر ناگ کے پھن کا ایک حصہ موجود تھا۔ جس سے خیال ہوتا تھا۔ کہ یہ لکڑی کی مورتی غالباً شوکی ہوگی۔ اور اس سمے کی تفسیر تھی۔ جب شو جلال میں آگئے تھے۔ اور ساری دنیا کو بھسم کرنے پر تل گئے تھے۔

لکڑ بابا نے داڑھی بڑھالی۔ گیروے دستر پہنے۔ سیاہ رنگ کی بڑی بڑی مالائیں اپنے گلے میں ڈال لیں اور اس گلی کے نکڑ پر جامن کے پیڑ کے نیچے آبیٹھا۔ اس نے بہت سے چھوٹے بڑے پتھر جمع کر کے اس پیڑ کے نیچے ایک چھوٹا سا دیول بنایا۔ اور لکڑی کے چہرے پر سیندور مل کر اسے دیول کے اندر رکھ دیا۔ صبح سویرے جب سورج کی پہلی کرنیں اس چہرے پر پڑتیں تو شنگرفی رنگ کا لکڑی کا چہرہ سچ مچ غیظ و غضب میں گھورتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس پر لکڑ بابا دیول کے قدموں میں بیٹھے ہوئے گاہے گاہے اپنا پرانا زنگ آلود بڑا سا چمٹا اٹھاتے اور دو تین بار زمین پر زور زور سے پٹک کر کہتے :-

"جلا ڈالوں گا۔ بھسم کر دوں گا۔" یہ خوفناک آواز سن کر اور شوجی کا

حیلاوں میں آیا ہوا جہسد دیکھ کر بہت سے راہ چلتے رک جاتے، اور جھک کر دیوں کو ڈنڈوت کرتے، اور حسب استطاعت، چڑھاوا بھی چڑھاتے۔ پہلے ہی دن دیول میں چار روپے کا چڑھاوا چڑھا۔ دو مہینے بعد جب لکڑ بابا اس قابل ہو گیا کہ کنڈا گام میں اپنی بیوی کو راٹھ روپئے منی آرڈر کر سکے پانچ سالوں میں یہ پہلی کمائی تھی جو بمبئی آنے کے بعد اس نے پہلی مرتبہ اپنی بیوی کو بھیجی تھی۔ لکڑ بابا کے ماں باپ نے بچپن میں ہی اس کی شادی کر دی تھی۔ اور جب وہ کنڈا گام سے بھاگ کر بمبئی آیا تو اپنی بیوی کی گود میں ایک چھوٹی سی لڑکی چھوڑ کر آیا تھا۔

جامن کے پیڑ کا لکڑ دیول آس پاس کے علاقے میں بہت مشہور ہو گیا خاص طور پر مراٹھی عوام میں۔ اسی لکڑ دیول کی مناسبت سے اسے لکڑ بابا کہنے لگے تھے۔ لکڑ بابا نے جان بوجھ کر ایک نیم پاگل کی دھیج بنائی تھی۔ اور دن رات مراٹھی میں اناپ شناپ بولتا رہتا تھا۔ جس کا مطلب سٹے باز اپنے ڈھنگ کا لگا لیتے تھے۔ چنانچہ دور دور سے سٹے باز اس دیول کے بابا کی مجنونانہ حرکت اور گفتگو سے نمبر نکالنے آتے تھے۔

ان بیس برس میں لکڑ دیول اور لکڑ بابا دونوں بہت مشہور ہو گئے تھے۔ علاقہ بہت غریب تھا۔ پھر بھی پندرہ بیس روپے کا چڑھاوا روز

چڑھتا تھا۔ ہر ماہ لکشمی بابا اپنے گھر کنڈا گام میں اپنی بیوی کو دو سو روپے منی آرڈر کرتا تھا۔ اور دوسرے تیسرے سال کاشی جاترا کا بہانہ کر کے کنڈا گام بھی جاتا تھا۔ جہاں اس نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ وہ لنکا میں ڈرائی فروٹ کا دھندا کرتا ہے۔

ان بیس برس میں اس نے اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ دو لڑکے اور بھی ہو گئے تھے۔ ایک میٹرک میں پڑھتا تھا۔ دوسرا کالج میں داخل ہو چکا تھا۔

زندگی بہت عمدہ طریقے سے چل رہی تھی۔ اگر وہ پڑھ لکھ کر آئی۔ اے ایس بن جاتا تو کیا اس سے زیادہ تنخواہ پاتا۔؟

پھر بھی اس کا ضمیر مطمئن نہیں تھا۔ اس لئے جب وہ پچاس کے پیٹے میں آیا تو اس نے اس دھندے کو خیر باد کرنے کا سوچا۔ مگر اس کی بیوی نہیں مانی۔ لڑکے پڑھ لکھ کے کام سے لگ جائیں تو چھوڑنا۔ کون بے وقوف ہو گا جو اپنی لگی لگائی روزی پر لات مارتا ہے۔ ؟ اس کی بیوی کسی طرح اپنا دو سو کا منی آرڈر چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔

پھر چنبیلی بھی تھی۔ کیونکہ ہر مرد کو چاہے وہ فقیر ہی کیوں نہ بن جائے سیکس بھی چاہیئے اور وہ کہیں دوسرے تیسرے سال ہی کنڈا گام جا سکتا تھا۔ اس لئے اب چمیلی اس کی زندگی میں آ گئی تھی۔ شریف خاموش طبیعت

کی بیوہ تھی؛ دو اس کی لڑکیاں تھیں، پہلے خاوند سے، اور وہ بے چارا اُس کے لئے ایک چھدام بھی چھوڑ نہ گیا تھا۔ ملکھ بابا اُسے بھی ایک سو روپے مہینہ دیتا تھا۔ معاملہ ایسی خاموشی ہوشیاری اور رازداری سے چل رہا تھا۔ کہ کسی کو ان پر شک نہ گذر سکتا تھا۔ چمبیلی بھی کسی طرح اپنے سو روپے سے منہ موڑنے کے لئے تیار نہ تھی۔

مگر بیس برس تک ایک ہی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ملکھ بابا اپنی زندگی سے اُوب چکا تھا۔ ایک عرصے سے اس کا دل سیر و سیاحت کے لئے بے تاب ہونے لگا تھا اُس کا دل اپنے ملک سے باہر اُن دیسوں کی سیاحت کرنے کو چاہتا تھا۔ جہاں اب بھی پرانے ہندو کلچر کے آثار ملتے ہیں۔ بالی کا جزیرہ اور تھائی لینڈ اور رنگ کرکے پرانے مندر اور بنکاک کے پگوڈا اس کی نظروں میں تیرتے اور وہ انہیں دیکھنے کے لئے اتاولا ہوا اٹھتا۔

ایک عرصے سے وہ اپنے دلیوں کی آمدنی کا ایک حصہ، ذیول کے نیچے زمین میں مٹی کی ایک بہت بڑی ہانڈی میں دفن کر رہا تھا۔ اسی ہانڈی میں اس نے "مجھے" بھی ڈال دیا۔ جہاں میری طرح کے بھائی بند جانے کتنے عرصے سے اس میں نیند تھے۔ آدمی اور نوٹ اسی وقت تک کسی قیمت کے سمجھے جاتے ہیں، جب تک کام کرتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں۔ حرکت کرتے ہیں اور محنت کرتے

ہیں۔ ورنہ آدمی گوشت کا لوتھڑا ہے۔ اور نوٹ محض کاغذ کا ایک پرزہ۔ اس حقیقت کا صحیح انکشاف مجھ پر اس ہانڈی ہی میں ہوا۔ جہاں میں پانچ سال تک قید رہا۔ ......... کیا بتاؤں اس ہانڈی کی تنگ و تاریک کال کوٹھری میں، میں باہر کی کھلی ہوا میں آنے اور آدمیوں کے ہاتھوں میں گھومنے کے لئے کس قدر بے تاب تھا۔ مگر میں اپنے بھائی بندوں کے ساتھ جمع ہو رہا تھا۔ اور یہیں پانچ سال تک اس گھٹی گھٹی فضا میں رہنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ سرمائے کے جمع ہونے کا عمل جب وہ محض ایک ذات یا فرد تک محدود ہو جاتا ہے۔ کس قدر محدود اور بدبودار عمل ہوتا ہے۔ اس بڑی ہانڈی میں تیس ہزار کی رقم جمع ہو چکی تھی۔ لکڑ بابا کا ارادہ چالیس ہزار تک جمع کر کے سیر و سیاحت کے لئے اچانک نکل جانے کا تھا۔ لیکن یہ چالیس ہزار کی رقم جمع ہونے تک مجھے پانچ سات سال کے لئے اور قید رہنا پڑتا۔ مگر اتنے میں لکڑ بابا اچانک بیمار پڑ گیا۔ لکڑ بابا کی صحت بالعموم اچھی رہتی تھی۔ اور وہ شاذ و نادر ہی بیمار پڑتا تھا۔ اور جب بیمار پڑتا تھا۔ تو کوئی دوا استعمال نہ کرتا تھا اس کے جسم کا مدافعتی نظام اس قدر مضبوط تھا کہ خود بخود اچھا ہو جاتا تھا۔ اس دفعہ بھی اس نے یہی کیا۔ کوئی دوا نہ کھائی۔ مگر دن بدن گذرتے گئے اور وہ اچھا نہ ہوا۔

اس سے پیٹ کا درد بڑھتا گیا۔ اور بخار بھی بڑھتا گیا۔ اور دن رات کھانسنے کھکارنے سے وہ کمزور ہو گیا۔

چمیلی دن رات اس کی تیمارداری کرتی تھی۔ ایک اور بھگت بھی آتا تھا۔ اس کا نام جگن ناتھ تھا۔ وہ ایک فلمی ایکسٹرا تھا۔ مگر فلموں میں کام نہ ملنے اور کام سے پیسہ نہ ملنے پر متواتر فاقوں کا شکار ہوتے ہوتے اس نے لکڑ بابا کا چیلا بن جانے میں اپنی عافیت سمجھی تھی۔ حالانکہ وہ بھی تیمارداری کرنے کے لئے دن رات رہنے پر تیار تھا۔ مگر لکڑ بابا رات کو اسے جامن کے پیڑ کے نیچے سلانے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے وہ صرف دن میں موجود رہتا تھا۔ اور شام ہوتے ہی لکڑ بابا اسے وہاں سے بھگا دیتا تھا۔

چمیلی نے بار بار اصرار کیا کہ وہ کسی ڈاکٹر کو دکھا دے۔ ایک بار وہ خود ڈاکٹر لے کر آ گئی۔ مگر لکڑ بابا نے ڈاکٹر کو دکھانے سے انکار کر دیا۔ جگن ناتھ بھی علاج پر بہت زور دے رہا تھا۔ مگر لکڑ بابا کسی کی نہ سنتا تھا۔ آخر جب مرض حد سے تجاوز کر گیا اور لکڑ بابا کا بخار ہذیان کی صورت اختیار کر گیا۔ تو چمیلی اور جگن ناتھ دونوں جا کر ایک ڈاکٹر کو بلا لائے۔ ڈاکٹر نے آ کر مریض کو الٹ پلٹ کر اچھی طرح سے دیکھا۔ پھر منہ لٹکا کے بولا۔

"اسے تو ڈبل نمونیا ہے۔ اور حالت بہت بگڑ چکی ہے۔ کہہ نہیں سکتا

کہ بچے گا بھی کہ نہیں۔ اگلے چوبیس گھنٹے کے بجائے اڑتالیس گھنٹے اور کاٹ گیا۔ مگر اچھا نہیں ہوا۔ حالت بگڑتی ہی گئی اس اثنا میں دو ڈاکٹر بدلے گئے۔ مگر دونوں نے نا امیدی ظاہر کی۔ آخری ڈاکٹر نے تو سر ہلا کے یہاں تک کہہ دیا۔

" مریض اب کوما میں چلا گیا ہے اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ہو دو ادن اور کاٹ جائے۔ تین دن کاٹ جائے۔ مگر اس سے زیادہ عرصے زندہ نہیں رہے گا۔ بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔"

اتفاق سے جس دن ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا، اسی دن شہر میں ایک بہت بڑا جلوس نکلا ہوا یہ کہ جب مہاراشٹر اسٹیٹ الگ سے بنائی گئی۔ اس وقت کنڈالگام کا شہر اور اس کے آس پاس کا علاقہ مہاراشٹر میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بدستور میسور کے علاقے میں ہی شامل رہا۔ حالانکہ اس علاقے کی کثیر آبادی مراٹھوں پر مشتمل تھی۔ خود لکڑ بابا مراٹھا تھا مراٹھے ایک عرصہ سے کنڈالگام کے علاقے کو مہاراشٹر میں ضم کرنے پر زور دے رہے تھے۔ اور کرناٹک کے لوگ کنڈگام نتا نتی تھی۔ اور ریلیے اور جلوس۔ پمفلٹ بازی اور اخباری ہنگاموں سے شہر کے لوگوں کے جذبات اس حد تک بھڑک چکے تھے کہ انہوں نے آج شہر بند کا اعلان کر کے ایک شاندار جلوس نکالنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

اُدھر جلوس مختلف آبادیوں سے گذرتا ہوا۔ لکڑ دیول کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ادھر لکڑ بابا ہذیان کی شدت میں کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہیں پر وہ اپنے تحت الشعور میں اپنے گھر کو یاد کر رہا تھا۔ اپنے بیوی بچوں سے مخاطب تھا۔ کہیں پر اس کی نظروں کے سامنے وہ ہنڈیا گھوم رہی ہوگی۔ جس میں اس کی زندگی کی کمائی بند تھی۔ مگر مرض نے آخری نقطے پر پہنچ کر۔ اُس کے ہوش وحواس اس سے چھین لئے تھے۔ بابا سہذیانی کیفیت میں اس کے منہ سے جو الفاظ نکلتے۔ وہ تو سارے سمجھ میں نہ آتے۔ بار بار یہی سنائی دیتا اور سمجھ میں آتا...

..."کنڈا گام... ... کنڈا گام"۔

جلوس کے نعرے اب قریب آگئے تھے۔ اور صاف صاف سنائی دے رہے تھے۔

کنڈا گام !؟'

کنڈا گام !؟'

"لے کے رہیں گے۔

"کنڈا گام؟

"لے کے رہیں گے !

"کنڈا گام !"

کنڈاگام!"

"ہمارا اشٹرا کا ہے"

"کنڈاگام کو میسور سے چھین کر رہیں گے"

"ہنس کے لیا ہے؟"

"ہمارا اشٹر وحام"

"لڑکے لیں گے"؟

"کنڈاگام ہے!

لے کر رہیں گے

لکڑ بابا کی سُرخ آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا ہوئی۔ انتہائی کوشش کرنے کے بعد زور سے اس کے منہ سے نکلا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کنڈاگام

جلوس میں چلنے والے لوگ لکڑ بابا کے قریب رُک گئے۔ اُن میں بہت سے جوشیلے سر پھرے نوجوان تھے۔ انہوں نے جب لکڑ بابا کے منہ سے گنڈاگام کا نام سُنا تو بہت خوش ہوئے۔ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

"سادھو بابا بھی ہمارے ساتھ ہے۔ کنڈاگام کا نام لیتا ہے"

"کنڈاگام زندہ باد"

"آگے جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آگے جاؤ۔" چمبلی بھیڑ کو ہٹانے کی کوشش

کرتی ہوئی بولی "مگر بابا بہت بیمار ہے۔ بخار اس کے سر کو چڑھ گیا ہے۔ ایسی ہی بولتا ہے۔"

مگر بخار تو ان نوجوانوں کے سر کو بھی چڑھ گیا تھا۔ وہ آپس میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگے۔ خصوصاً چمیلی اور جگن ناتھ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"بابا بچیں گے نہیں۔؟"

"مرنے والے ہیں؟"

"کوئی دم کے مہمان ہیں۔؟"

"یہ فقرے دہراتے ہوئے چند نوجوانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ایک سرپھرا بولا۔

"مرنے والا تو ہے۔ سالے کو جلا دو ابھی۔!"

"ہاں پٹرول چھڑک کے پھونک دو۔"

"مر جائے گا تو نام کر جائے گا۔"

"اخباروں میں نکلے گا۔ ایک مراٹھی سادھو کنڈا گام حاصل کرنے کے لیے جل کر مر گیا۔"

"پہلے صفحے پر سرخی آئے گی۔ حکومت کو کنڈا گام اپنے کو دینا ہی پڑے گا۔"

"پھر دیکھتے کیا ہو لگا دو آگ۔"

"نہیں نہیں ۔۔۔۔۔ ۔" چمیلی آخری نوجوان سن کر زور زور سے چیخی مگر اس کی کسی نے نہیں سنی۔ چمیلی اور جیمن ناتھ کو دھکے مار کے وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

"بھگوان کے لئے دیا کرو۔ بھگوان کے لئے۔ چمیلی گھٹنوں کے بل جھک کر التجا کرنے لگی۔

اتنے میں جلوس کے پیچھے سے ایک نوجوان دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے پٹرول کا پورا ڈبہ لکڑ بابا پر چھڑک دیا۔ دوسرے نے تیلی دکھا دی۔ تیسرے نے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر اور پٹرول چھڑک دیا۔

"کیا کرتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ چمیلی دوہتڑ مار کے اپنا سینہ کوٹ کر بولی۔

"ابھی تو یہ زندہ ہے۔ زندہ ہے۔

لکڑ بابا زندہ جل رہا تھا۔ شعلوں کی زبانیں کئی کئی گز اوپر جا رہی تھیں وہ زبانیں لکڑ بابا کا جسم چاٹ چاٹ کر اسے خاک میں ملا رہی تھیں۔ جوں جوں شعلے اوپر جاتے مجمع کا جوش بڑھتا جاتا۔

لکڑ بابا زندہ باد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لکڑ بابا زندہ باد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کنڈا گام ہمارا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کنڈا گام ہماری ریاست کا ہے۔"

فلک شگاف نعرے لگ رہے تھے۔ لکڑ بابا کا جسم جل رہا تھا۔ آگے جانے

والے جلوس کے بہت سے لوگ پیچھے مڑ آتے تھے۔ اور جامن کے پیڑ کے نیچے
ایک بہت بڑا حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ صرف چند لوگوں نے نوجوانوں کو پیٹرول
چھڑکتے دیکھا تھا۔ باقی سب لوگ یہی سمجھ رہے تھے۔ کہ لکڑ بابا نے کنڈا گام کو
مہاراشٹر میں ضم کرنے کے لئے اپنی جان کی آہوتی دیدی ہے۔

اتنے میں دو پریس فوٹو گرافر بھی کہیں سے آگئے۔ اور دھڑا دھڑ اس منظر
کی تصویریں اتارنے لگے۔ زندگی میں اتنا بڑا موقعہ انہیں پہلی بار ملا تھا۔ کل
ہندوستان کے سارے اخباروں کے پہلے صفحے پر جلتے ہوئے لکڑ بابا کی تصویر ہوگی۔

جلوس آگے چلا گیا۔ مگر کچھ نوجوان پچاس کے قریب، اُسی طرح حلقہ
بنائے جامن کے پیڑ کے نیچے کھڑے رہے اور اس وقت تک ڈٹے رہے —
جبتک لکڑ بابا کا جسم اچھی طرح جل کر راکھ نہیں ہو گیا۔

پھر بڑے زور کی آندھی آئی اور آندھی کے ساتھ ایسی موسلا دھار بارش کہ
پل میں جل تھل ہو گیا۔ ہوا کے تیز جھونکے اور بارش کے تریڑے لکڑ بابا کی
آخری راکھ کی چٹکی تک بہا کے لے گئے۔

صبح جب بارش تھمی تو لوگوں نے دیکھا کہ جہاں پر لکڑ بابا گذشتہ پینتیس ۳۵ سال سے بیٹھ رہا تھا۔ وہاں کی ساری زمین کی ایک موٹی تہہ تک جل گئی ہے۔ مگر لکڑ بابا کی ہڈیوں تک کا نشان باقی نہیں ہے۔ لکڑ دیول ایک طرف اوندھا پڑا ہے۔ اور اس کے نیچے کی زمین کھدی پڑی ہے۔ رات کی تاریکی میں جگن ناتھ چیلا لکڑ بابا کی عمر بھر کی کمائی ہنڈیا میں سے نکال کر اڑنچھو ہو گیا تھا۔ صرف ہنڈیا کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اِدھر اُدھر پڑے تھے۔

# دسواں باب

اس واقعے کے تیسرے روز فیمس بلڈنگ مہالکشمی میں ایک نئی فلم کمپنی کا دفتر کھل گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "دی کنڈاگام پکچرز" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور فلم کمپنی کے دروازے کے باہر بھورے رنگ کی ایک تختی پر پروپرائیٹر کا نام لکھا تھا۔

"جے۔ این۔ لکڑ والا۔ J. N. Lakkar Wala

وہ آدمی جو کل تک ایک فلمی ایکسٹرا تھا۔ اچانک فلم پروڈیوسر کیسے بن گیا؟ اس پر کسی کو حیرت نہیں ہوئی۔ فلمی دنیا میں تو یوں اکثر ہوتا رہتا ہے۔

اس واقعے کے ٹھیک دس روز کے بعد لب ساحل ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں ہزاروں آدمیوں نے شرکت کی۔ یہ جلسہ لکڑ بابا میموریل کمیٹی کی طرف سے تھا جس کا سکریٹری جے۔ این۔ لکڑ والا تھا۔ کئی فلمی ستاروں اور حکومت کے وزیروں نے اس جلسے میں شرکت کی تھی۔ اسٹیج پر لکڑ بابا کی ایک بہت بڑی رنگین تصویر سنہرے فریم میں جڑی رکھی تھی۔ کھچڑی داڑھی۔ لمبی جٹائیں اور نورانی چہرہ۔ تصویر بہت حد تک فرضی تھی۔ جے۔ این۔ لکڑ والا نے ایک فلمی مصور

کو ڈیڑھ سو روپے دے کر تیار کرائی تھی۔ اس تصویر کے فریم کے گرد کرنسی نوٹوں کا ایک ہار لپٹا ہوا تھا۔ ایک ایک روپے کے نوٹ تھے۔ بیچ میں " مجھے " بھی دس کے روپے کے ایک نوٹ کو ٹانک دیا گیا تھا۔ پانسو کے نوٹوں کا ہار تھا۔ مجھے لکڑ بابا کے بھگت جگن ناتھ لکڑ والا نے ازراہِ عقیدت لکڑ بابا میموریل کمیٹی کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ اس اعلان پر ـــــــ دو منٹ تک تالی پیٹی رہی۔

کلچر منسٹر کی تقریر بہت عمدہ تھی۔ انھوں نے بتایا کہ عام طور پر سادھوؤں کو سماج کا ایک عضو معطل سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ایک طرح سے سماج پر بوجھ۔ لکڑ بابا نے کنڈاگام کو مہاراسٹر میں ملا دینے کی تحریک میں خوشی خوشی اپنی زندگی کی قربانی دے کر دنیا کے سامنے ایثار۔ عزم کامل ۔ جہد مسلسل۔ سچائی اور اصول کی خاطر اٹل رہنے کی ایسی شاندار مثال پیش کی ہے۔ جس کی نظیر صدیوں تک ملنا مشکل ہے۔ لہذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ایسی مہان آتما... اس .... اس ... د یہاں تک پہنچتے پہنچتے کلچر منسٹر کی آواز بھر آگئی) اس نڈر دلیر اور امر شہید سنت لکڑ بابا کی یاد کو لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ تازہ رکھنے کے لئے ایک ایسی یادگار قائم کی جائے جو سنت لکڑ بابا کی شان کے شایاں ہو

.... (پر زور تالیاں)

میئر نے اعلان کیا کہ جس جگہ پر شہید نے اپنے جیون کا بلیدان دیا ہے وہ جگہ کارپوریشن کے فیصلے کے مطابق لکڑ بابا میموریل کمیٹی کو دی جاتی ہے تاکہ

وہ اس جگہ پر جہاں پر لکڑ بابا کا لکڑ دیول واقع تھا ایک پختہ مندر تعمیر کرے ۔ اس پر مجمع بھی دیر تک تالیاں پیٹتی رہیں ۔

مندر بنانے کے لئے بیس ہزار کی رقم نوٹ ، چیک اور نقدی کی صورت میں اسی وقت وصول ہو گئے ۔ اور تیس ہزار کے وعدے وعہد بھی کئے گئے جے ۔ این ۔ لکڑ والا نے اس کے بعد لکڑ بابا کی سنہری فریم میں جڑی رنگین تصویر کو نیلام کرنے کا اعلان کیا ۔ جس پر پالسنو کی رقم کا ہار پڑا تھا ۔ ۔ ۔ پہلی بولی انہوں نے خود دی ۔ ایک ہزار روپے کی ۔

جب مجمعے کے مختلف حصوں میں بولیاں دی جا رہی تھیں ۔ اسی وقت جے ۔ این ۔ لکڑ والا ڈائس پر ایک کرسی کے پیچھے پہنچا ۔ ۔ ۔ جس پر ایک نہایت خوبصورت عورت بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس عورت کو میں نے فوراً پہچان لیا ۔ یہ سوزی کے ہوٹل والی شہزادی تھی ۔ جو اب ایک مشہور فلم اسٹار بن چکی تھی ۔ جے ۔ این نے اس کے کان میں کہا ۔

" اس ہار کو تم خرید لو ۔ کسی قیمت پر جانے نہ دینا ۔ اس سے تمہاری بہت پبلسٹی ہو جائے گی ۔ "

شہزادی نے بولیوں کے بیچ میں تین ہزار کی آفر دی ۔ پھر جب بولی بڑھ کے چار ہزار سات سو ہو گئی تو اس نے پانچ ہزار

کی بولی دی ۔ جب بولی بڑھ کے ساڑھے چھ ہزار ہو گئی تو اس نے سات ہزار کی بولی دی ۔ بالآخر یہ تصویر شہزادی کے حصے میں آئی ۔ آٹھ ہزار پر ۔

جب کلچر منسٹر نے جو اس جلسے کی صدارت بھی کر رہے تھے ۔ اپنے ہاتھوں سے مہرتی لکڑ بابا کی تصویر میز سے اٹھا کر مشہور فلم اسٹار شہزادی کو پیش کی ۔ ... تو بیک وقت کئی کیمرے حرکت میں آ گئے ۔ اور کھٹا کھٹ تصویریں کھینچنے لگیں ۔ اس وقت لوگ اس قدر جوش میں آ گئے تھے کہ تالیوں کی آسمان تک جا رہی تھی لوگ چلا چلا کر نعرے لگا رہے تھے ۔

"لکڑ بابا زندہ باد"

"شہزادی زندہ باد"

"انقلاب زندہ باد"

سب سے آخر میں جے ۔ این ۔ لکڑ والا نے اعلان کیا کہ وہ لکڑ بابا کی زندگی پر ایسٹ مین کلر میں ایک دھار تک تصویر بنانے جا رہے ہیں ۔ اس تصویر کا نام ہوگا ۔۔ "سنت لکڑ لیشور" ۔

اس پر اتنے زور کی تالیاں پٹیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی چھت اڑ جائے گی

اس رات جے۔ این لکڑ والا نے اپنے گرگوں کی ٹولی میں، جس میں بیشتر لکڑ بابا میموریل کمیٹی کے ممبر تھے۔ اعلان کیا" بھائی لوگو! فلم تو اب بن جائیگی اور جب تک مندر بنتا رہے گا ہماری فلم بھی بنتی رہے گی۔ میں نے اس فلم میں مشہور فلم اسٹار شہزادی کو بطور ہیروئن پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

اس رات جے این لکڑ والا نے فلم اسٹار شہزادی کے گھر جاکر اسے سات ہزار روپے کا ایڈوانس دیا۔ دو ہزار سفید... اور پانچ ہزار کالا۔

نوٹ لے کر فلم اسٹار شہزادی نے بصد ناز و تمکنت اعلان کیا۔

" میں اس فلم میں کام تو کروں گی۔ مگر کہانی سن کر...... اور اگر کہانی میری مرضی کے مطابق نہ ہوئی تو ایڈوانس واپس کر دوں گی "

" جی کہانی تو آپ پر ہے۔ ساری کی ساری۔ بس کہیں کہیں بیچ میں لکڑ بابا کھڑتال بجاتے اور بھجن گاتے دکھائی دیں گے "

" تو سناؤ "

" یہاں کیا سناؤں گا کہانی....... ؟ " جے۔ این

مسکرا کر بولا "میں نے دو دن کے لئے تاج میں ایک کمرہ بک کرا لیا ہے ۔ آپ چلئے وہاں میرے ساتھ ۔ اور اطمینان سے سنئے کہانی "۔

# گیارہواں باب

کہانی شہزادی کو بہت پسند آئی ۔ اس کے بعد کئی ہفتوں تک
مشہور فلم اسٹار شہزادی کے خصوصی انٹرویو اور مضامین ملک کے مشہور
فلمی پرچوں میں چھپتے رہے۔ مختلف عنوانات سے " میں لکڑ بابا سے
لکڑ بابا کے روحانی معجزے میں کب ؟ کیوں ؟ اور کیسے لکڑ بابا سے
متاثر ہوئی ؟ . . . . وغیرہ وغیرہ ۔ ان مضامین کے ساتھ مشہور فلم اسٹار
شہزادی کی انتہائی دلآویز اور دلکش رنگین تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں
ایک تصویر میں وہ جوگن بنی بیٹھی ہیں ۔ اور اک عجب تقدس
اور روحانیت کے عالم میں سدنت لکڑ بابا کی تصویر کو دیکھ رہی ہیں ایک
تصویر میں وہ باتھ روم سے نہا کر نکل رہی ہیں۔ اُن کا شفاف بدن ،
باریک مہین کپڑوں سے چھن رہا ہے ۔ اور وہ انتہائی خضوع و خشوع
کے عالم میں قریب کی دیوار سے ٹنگی لکڑ بابا کی تصویر کے سامنے رک

کر ہاتھ جوڑ کر، سر جھکا رہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ....!

ان تصاویر اور مضامین کی اشاعت سے پبلک کی دلچسپی اس آنے والی فلم میں اس قدر بڑھ گئی کہ پہلے دن کی شوٹنگ سے پہلے ہی اس پکچر کی ساری Territories ڈسٹری بیوٹروں نے خرید لیں اور کنٹرا گام پکچرز، یعنی جے۔ این۔ ہکڑ والی کی مالی حالت مستحکم ہو گئی اس نے ایک گاڑی خرید ی۔ دوسری پکچر کا اعلان بھی کر دیا اب اس کے فرصت کے اوقات زیادہ تر شہزادی کے ساتھ گذرنے لگے کیونکہ اس نے دوسری پکچر کے لئے بھی اسی کے ساتھ الگریمنٹ کر لیا تھا۔

کئی ہفتوں تک میں شہزادی کے ڈرائنگ روم میں ہکڑ بابا کی تصویر کے فریم کے گرد، لونگوں کے ہار ہیں ٹنگا رہا۔ شہزادی کا سب سے چھوٹا بھائی گھر کا لاڈلا تھا۔ کیونکہ سب سے چھوٹا وہی تھا گھر کے لوگ اسے پیار سے منا کہتے تھے۔

یوں تو منا کو اسکی ماں اور شہزادی دونوں پاکٹ منی دیتے تھے۔ مگر منا لاڈلے بچوں کی طرح بہت شاہ خرچ تھا اور اب اس

نے ماں، بہن کے علاوہ لکڑ بابا سے بھی روپیہ نکال لینے کا طریقہ ایجاد کرلیا تھا۔ وہ بہت ذہین بچہ تھا۔ اور جب اس کی فضول خرچی کو روکنے کے لئے یا اسے سزا دینے کے لئے امی اور شہزادی اس کی پاکٹ منی روک دیتے یا پاکٹ منی جلد ختم ہو جاتی اور منا کو مزید رقم کی ضرورت پڑتی تو وہ سب کی نظر بچا کر ایک کرسی پر اسٹول رکھ کر کسی نہ کسی طرح لکڑ بابا کی تصویر تک پہونچ جاتا اور ہاتھ جوڑ کر کہتا۔

"لکڑ بابا بھیل پوری کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ اگر برا نہ مانو تو تمہارے ہار میں سے ایک روپیہ لے لوں؟"

"لے لوں!"

"بس ایک۔ روپیہ لوں گا۔ صرف ایک۔ اور پھر کبھی نہیں لوں گا۔

اس پر منا محسوس کرتا جیسے لکڑ بابا تصویر میں سے جھانک کر اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ اور اسے ہار میں سے ایک روپیہ نکالنے کی اجازت دیدی ہے۔ اس پر منا خوش ہو کر لکڑ بابا کی تصویر چوم لیتا اور ہار میں سے ایک روپئے کا نوٹ نکال کر چلا جاتا۔

مدتوں یہی عمل جاری رہا۔ کبھی بھیل پوری کیلئے۔ کبھی بادہ مصالحے کی چاٹ کے لئے۔ کبھی آئس کریم کیلئے۔ کبھی غباروں کیلئے، کھلونوں کیلئے دوستوں کو قرض دینے کیلئے..... ایک روپئے کے نوٹ ہار میں سے نکلنے

رہے۔

شروع شروع میں تو پتہ نہیں چلا۔ پھر ہولے ہولے ہار خالی ہونا شروع ہوا۔ بیچ بیچ میں سے گنجا ہونے لگا۔ ایسے لگا جیسے پت جھڑ کا موسم ہار پر آچلا ہے۔ ایک دن منا صاحب علیں اس عالم میں پکڑے گئے۔ وہ جب کرسی پر تپائی رکھ کر نوٹوں کے ہار میں سے "تجھے" نکال رہے تھے۔ شہزادی کو اس سے پہلے تو گھر کے نوکروں پر شبہ تھا۔ لیکن جب ایک نوکر شہزادی کو جلدی سے بلا کر لایا اور انھیں منا صاحب کو ہاتھ سے چھین کر اپنے پرس میں ڈال لیا۔ . . . بلکہ سارا ہار ہی نوچ کر اپنے پرس میں ڈال لیا۔

اس پر منا شہزادی کی گود میں لیٹا لیٹا ٹانگیں ہلا ہلا کر مچلنے لگا۔ زور زور سے چیخنے چلانے لگا۔ تو شہزادی نے اسے اور مارا۔ اور مارا اتنا مارا کہ امی دوڑتی دوڑتی ڈرائنگ روم میں گھس آئیں، اور بچے کو اسکی گود سے چھین کر غضبناک آواز میں بولیں :۔

"ارے ... ارے .... ارے ... یہ کیا کرتی ہو؟ اپنی ہی کوکھ کے جائے پر اتنا ظلم ڈھاتی ہو۔ صرف دس روپلوں کیلئے؟ اپنے ہی بچے پر؟ تمہیں شرم نہیں آتی؟"

کہنے کو امی جان نے غصے میں اتنا کہہ دیا۔ مگر کہتے کہتے انھوں نے

اپنی غلطی محسوس کرکے دانتوں کے تلے انگلی داب لی شہزادی نے بھی منہ پر انگلی رکھ کر جلدی سے ادھر اُدھر دیکھا۔ اتفاق سے اس وقت ڈرائنگ روم میں ماں بیٹی اور بچے کے علاوہ اور کوئی موجود نہ تھا۔ شہزادی کی جان میں جان آئی۔ ماں، شرمندہ ہو کے چپ تھیں۔ منا، نکی چھاتیوں میں ڈبکا ہوا منہ چھپائے ہوئے تھا۔ سارے کمرے میں سناٹا تھا۔

یکایک منا نے سر اٹھا کے شہزادی کی طرف دیکھا اور سسکتے سسکتے کہا۔

"ہم کو دس روپلے دیدو! نہیں تو ہم سب سے کہدیں گے۔ ہم امی کے بیٹے نہیں ہیں۔ شہزادی کے بیٹے ہیں۔"

اپنی ماں سے دس روپلے لیکر منا اپنی نئی طاقت کے احساس میں سرشار اپنی نانی کی گود سے اترا۔ اور باہر بازار میں آئس کریم کھانے چلا گیا اگر یہ اس کی زندگی کا پہلا بلیک میل تھا تو کیا ہوا۔ ابھی تو اس کی عمر صرف سات سال ہے۔

# بارھواں باب

آئیس کریم اینڈ ملک بار کی کاونٹر سے ہیں فیروز اور خانم کے ساتھ کرایا گیا۔ جو ملک بار سے آئیس کریم کھا کے نکل رہے تھے۔ دوکان سے باہر نکل کے خانم کو یاد آیا کہ اُن کے علاقے ہیں وناسپتی گھی بھی بلیک میں چلا گیا ہے۔ اس لئے اُنہوں نے قریب کے بنیئے کی دکان سے وناسپتی گھی کا ایک ڈبہ خریدا۔ بنیئے کی دوکان سے مجھے، مسز ایڈل جی کے ہمراہ کر دیا گیا۔ جس نے بنیئے سے بہت سامان خریدا تھا۔ مسز ایڈل جی نے مجھے، ایک لساطی کے حوالے کر دیا۔ جس کی دوکان سے انھوں نے اپنے ڈرائنگ روم کے لئے نئے پردوں کا کپڑا خریدا تھا۔ اسی لساطی کی دوکان پر ابھی منظور کلرک اپنی بیوی بتول کے ہمراہ سیلز کاونٹر پر کھڑا اپنے گھر میں ہونیوالی پہلی خوشی کے سلسلے ہیں کچھ ضروری کپڑے خرید رہا تھا۔ بچے کے پوتڑوں۔ فراکوں اور ننھی ننھی رنگ دار ٹوپیوں کیلئے کپڑا۔ ان کے ساتھ ہیں شربت والے کی دوکان پر آیا۔ کیونکہ بتول کو پیاس لگ رہی تھی۔ شربت والے نے مجھے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کے سپرد کیا۔ جس نے اسکی دوکان سے یکے بعد دیگرے شربت

کے چار گلاس پیئے تھے۔ اس ادھیڑ عمر کے آدمی نے دوکان سے باہر نکل کر قریب کے دوافروش سے سر درد کی گولیوں کا ایک پورا ڈبہ خریدا۔ اس ادھیڑ عمر کے آدمی کی صورت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ نہ صرف اسے سدا سر درد رہتا ہے۔ بلکہ خود اس کی ذات دنیا کے لئے مستقل سر درد ہے۔ سر درد کی گولیاں خرید کردہ ادھیڑ عمر کا آدمی ایک ٹیکسی پر سوار ہوا اور اپنی منزل پر پہونچ کر اس نے مجھے ٹیکسی والے کے حوالے کیا۔ ٹیکسی والے نے پٹرول پمپ سے پٹرول ڈالا۔ "مجھے" پٹرول پمپ والے کو دیا۔ پٹرول پمپ والے نے ایک ایسے جوڑے کو دیا جنھوں نے پہلی بار موٹر خریدی ہو۔ اور اس میں بیٹھ کر سینما جا رہے تھے۔ سینما دیکھ کر میں ان کے ساتھ لوٹ رہا تھا۔ کہ پھر ایک پٹرول پمپ پر پہنچا دیا گیا۔ جہاں سے غلام محمد موٹر مکینک کی جیب میں پہنچا۔ غلام محمد مجھے باندرے کے تنندر حمام والے کے یہاں چلا گیا۔ حمام والے نے مجھے ایک حجام کے سپرد کیا۔ حجام نے کبابیئے کے سپرد کیا۔ کبابیئے نے کرائے میں "مجھے" کاف دلپسند کے مالک کے حوالے کیا جس کی دوکان کے باہر ایک کونے میں وہ کباب کی دوکان لگاتا تھا۔۔۔ کاف دلپسند کے یہاں سے میں ماسٹر برگانزا ٹیلر کی جیب میں آیا۔ جس نے دوسرے دن "مجھے" سیٹھ منگھارام کے حوالے کیا۔ جس نے ماسٹر برگانزا کی دوکان سے ایک سوٹ سلوایا تھا۔ سیٹھ منگھارام کی کلّا بے میں ایک

بہت بڑی کیوریو شاپ تھی۔ وہاں، جہاں بڑے بڑے امیر لوگ اور
غیر ملکی سیاح نوادر خریدنے آتے تھے۔ منگھارام ایسی ایسی نادر چیزیں
اپنی دوکان میں جمع کر کے رکھتا تھا۔ ہانگ کانگ سے لے کر نیویارک
تک اس کے مال کی کھپت تھی۔ شہر کے باہر کئی علاقوں میں اس نے
چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں قایم کر رکھی تھیں۔ جہاں نہایت راز داری سے
پرانا مال تیار ہوتا تھا۔ ایک فیکٹری میں ساتویں صدی کے بدھ کے
بت بنائے جاتے تھے۔ ایک فیکٹری میں صرف وہ سامان جو دو صدی
قبل از مسیح سنگ جبل کے بت بنانے کے لئے وقف تھی۔ ایک فیکٹری میں
صرف وہ سامان تیار ہوتا تھا جو موہنجو داڑو اور ہڑپہ کی کھدائیوں
سے نکلا ہے۔ ایک فیکٹری صرف مغل عہد کے نوادر مینوفیکچر کرتی تھی
نور جہاں کا عطر دان۔ بابر کی تلوار۔ جہانگیر کا خنجر، جودھا بائی کی پوجا
کی تھالی، اکبر کی انگوٹھی۔ اورنگ زیب کا اگال دان اور ممتاز محل کا
پاندان سب کچھ سیٹھ منگھارام کے یہاں ملتا تھا۔ ایک فیکٹری پرانی
کھائی ہوئی لکڑی کے تاریخی سامان تیار کرتی تھی۔ یعنی اشوک کی خوابگاہ
کا دروازہ، چندر گپت کے پلنگ کا پایہ۔ مہارانی پدمنی کے آئینے کا چوبی
فریم۔ کالی داس کی چھڑی۔ گرو وشوامتر کی کھڑاؤں۔ ایک دفعہ تو منگھارام
کا ایک سیلز مین ایک یوروپین سیاح کو چانکیہ کی عینک تک بیچ دینے

میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بارہ سو روپئے ہیں۔ اور سیٹھ منگھا رام نے اپنے ملازم کی کارکردگی پر خوش ہو کر اسے سو روپئے انعام دیا تھا۔

کل رات سیٹھ نے دکان کے گلے میں سے کچھ رقم ادھار لی تھی۔ حساب پورا کرنے کے لئے اس نے اپنا بٹوا کھولا اور رقم برابر کر کے اس نے "مجھے" بھی نوٹوں میں ڈال کر کل رقم ایک ملازم کے حوالے کر کے کہا کہ وہ اسے کل کے حساب میں جمع کر کے بینک میں رقم ڈال آئے۔

سیٹھ کے ملازم نے رقم لیکر احتیاط سے سب نوٹوں کو گنا۔ "مجھے" دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ کیونکہ متواتر استعمال سے اور پانچ سال ایک گندی ہانڈی میں رہ کر میں اتنا کثیف، میلا اور خستہ ہو چکا تھا کہ ہر ایک کی نگاہوں میں چبھنے لگتا تھا۔

ملازم نے مجھے غور سے دیکھا۔ یہ وہی ملازم تھا جو گوردھان کیر کی عینک بیچ چکا تھا۔ دیکھتے میں اب میں اس قدر پرانا ہو چکا تھا کہ اگر مجھ پر انگریزی حروف چھپے ہوئے نہ ہوتے تو وہی ملازم "مجھے" محمد تغلق کے زمانے کا لوٹ سمجھ کر بیچنے پر تیار ہو جاتا۔ اس پر بھی وہ "مجھے" دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، اور جب اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ مجھ میں ایسے کونسے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ "مجھے" اس قدر

غور سے دیکھ رہا تھا۔ دس کا نوٹ ہی تو ہوں۔

"بالآخر وہ ملازم سیٹھ کے پاس پہنچا۔ سیٹھ کے سامنے میز پر مجھے رکھ کر بولا۔

ذرا اس نوٹ کو غور سے دیکھئے!"

سیٹھ نے مجھ پر سرسری سی ایک نظر ڈالی۔

"کیا دیکھوں؟ دس کا نوٹ ہی ہے۔ کیا تمہیں سو کا نوٹ دکھائی دیتا ہے"!

سیٹھ نے ملازم پر ایک طنز آمیز نگاہ ڈال کے کہا۔

"ذرا غور سے دیکھئے!" ملازم نے پھر اصرار کیا۔" انڈیا کی (ڈی) الٹی چھپ گئی ہے"۔ سیٹھ نے چونک کر دیکھا۔ واقعی میرے ماتھے پر جہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"RESERVEBANKOFINDIA" لکھا تھا۔ وہاں انڈیا کا لفظ یوں چھپا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ INДIA۔

"ارے واقعی D کی جگہ ᗡ ہے۔ یعنی الٹی ڈی"۔

اور ملازم نے "مجھے" بالکل سیٹھ کی آنکھوں کے نیچے سرکاتے ہوئے کہا۔

یہ دیکھئے جہاں لکھا ہے TOPAY THE BEARERONDEMAND

IPROMISE وہاں لفظ ــــــ IPROMISE کی "E" (ای)

غائب ہے"۔

"واقعی!" سیٹھ نے غور سے "مجھے" پرکھتے ہوئے کہا۔" واقعی! یہ تو۔

.... یہ تو ایک نایاب نوٹ ہے۔ سیٹھ منگھارام کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی ڈی الٹی ہے۔ اور سائی بالکل غائب ہے۔

یکایک سیٹھ کے دل میں ایک خیال گذرا۔ اس نے ملازم کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں جعلی تو نہیں ہے؟"

ملازم چپ رہا۔

کچھ سوچکر سیٹھ بولا "تم اس نوٹ کو یہیں چھوڑ کر جاؤ۔ میں سب معلوم کرتا ہوں!"

میری جگہ اس نے ملازم کو دس کا دوسرا نوٹ دے کر بینک بھیج دیا وہ خود کرنسی آفس میں فون کر کے "مجھے" اپنی جیب میں ڈال کے چلا گیا۔ پانچ چھ دن میں سیٹھ منگھارام کے پاس رہا۔ وہ اندر "مجھے" بڑی احتیاط سے اپنی تجوری میں بند کر دیتا تھا۔ سب پوچھ پاچھ کرنے کے بعد جب سیٹھ نے اپنا اطمینان کر لیا تو اس نے میرے لئے چاندی کا ایک فریم بنوایا اور اس میں "مجھے" جڑوا کر اس ملازم سے کہنے لگا۔

"میں نے سب معلوم کر لیا ہے۔ یہ نوٹ بالکل اصلی ہے۔ ناسک سے شائع ہوا تھا یہ۔ مگر ڈائی غلط ہو گئی۔ اور غلط چھپ گیا۔ اس کے سیریل نمبر کے دوسرے تمام نوٹ غلط چھپنے کی وجہ سے تلف کر دیئے گئے۔ مگر کسی

کارکن کی غلطی سے یہ نوٹ کرنسی میں آگیا۔ اپنی طرز کا واحد نوٹ ہے ہندوستان بھر میں بالکل نایاب ہے۔ میں اخباروں میں اس کا اشتہار دیتا ہوں اور اگلے ماہ کے نیلام میں اس کی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا۔ اور جو بھی قیمت حاصل ہو گی اس کا پانچ فیصد تمہیں دوں گا کیونکہ سب سے پہلے تم نے اس نوٹ کی نایاب خوبی کو پہچانا ہے۔

ملازم نے جھک کر شکریہ ادا کیا۔ اتنے میں سیٹھ کی نئی اسٹینو چند کاغذات ٹائپ کر کے حاضر ہوئی۔

سیٹھ منگھا رام پہلا خط پڑھتے ہی غصے سے بھڑک گیا "ہجے کی اتنی غلطیاں۔ " [illegible] .... اس طرح لکھا جاتا ہے ؟۔ Promised. کا "E" غائب ہے - اور ڈالر کا "اے"... A کدھر گیا؟ کیا گھر سے ناشتہ کر کے نہیں آتی ہو؟ جو یہاں لفظوں کے حروف کھانے شروع کر دیتی ہو؟ ہماری فرم نیو یارک تک بزنس کرتی ہے۔ ایسی غلطیاں ہجے کی یہاں نہیں چلیں گی۔ اکاؤنٹنٹ سے اپنا حساب چکت کرو اور جاؤ!"

سیٹھ نے کانپتی ہوئی نئی اسٹینو کے ہاتھ میں ٹائپ شدہ خط دستخط کئے بغیر واپس کرتے ہوئے کہا۔

اس دن نیلام میں بڑی بھیڑ تھی۔ جس دن میری بولی لگائی گئی۔ اور دور دور سے نادر اشیاء کو خریدنے والے آئے تھے، اور بڑی حیرت کسیقدر شبہے اور شوق سے "مجھے" دیکھ رہے تھے۔ مگر سیٹھ منگھارام نے شبہے کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی تھی۔ دمکتے ہوئے چاندی کے فریم میں سب کی نگاہوں کے سامنے میں موجود تھا۔ چاندی کے فریم کے نیچے ناسک پریس کا ایک سرکاری کاغذ ہوا میں ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ جس پر صاف الفاظ میں لکھا تھا کہ میں کوئی جعلی نوٹ نہیں ہوں۔ اصلی نوٹ ہوں۔ میری تاریخ اشاعت بھی درج تھی شبہے کا کوئی امکان نہ تھا۔

بولی شروع ہوئی۔

سیٹھ منگھارام نے چلا کر کہا" ڈالر کے نوٹ کی قیمت ایک ہزار روپئے"

"دو ہزار روپئے"

"تین ہزار روپئے"

"تین ہزار پانسو"

"تین ہزار سات سو"

"تین ہزار سات سو۔ تین ہزار سات سو"

"ساڑھے چار ہزار"۔

"پانچ ہزار"!

میرا سر چکرانے لگا۔ کیسی عجیب و غریب دنیا ہے۔ کل تک میں محض دس کا نوٹ تھا۔ آج میری قیمت پانچ ہزار روپئے ہے۔ مجھے وہ ہزاروں، آنکھیں یاد آگئیں جنھوں نے اب تک مجھے دیکھا تھا۔ اور ماتھے پر لکھے ہوئے لفظوں پر بھروسہ کیا تھا۔

I PROMISE TO PAY THE BEARER ON DEMAND

THE SUM OF RUPEES AT ONLY OFFICE OF ISSUE

"چھ ہزار روپئے"

"سات ہزار روپئے"۔

"سات ہزار آٹھ سو"!

"سات ہزار آٹھ سو۔ سات ہزار آٹھ سو۔۔۔ ایک!"

"آٹھ ہزار۔ نو ہزار، دس"!

دس ہزار!؟ میں حیرت سے چونک پڑا۔ کیا میری قیمت دس ہزار ہے؟ کل تک میں دس روپئے کا نوٹ تھا۔ آج میری قیمت دس ہزار روپئے کیسے ہوگئی؟ وہی میں ہوں۔ وہی کاغذ ہے۔ وہی ٹھپہ ہے۔

"بارہ ہزار"!

"بارہ ہزار ....؟ بارہ ہزار میں ایک لڑکی کی شادی ہو سکتی ہے!
مگر لولی بڑھتی ہی جارہی تھی۔

"تیرہ ہزار"

"تیرہ ہزار چھ سو"

"تیرہ ہزار نو سو"

"چودہ ہزار"

"اٹھارہ ہزار!"— ایک دبلا پتلا نوجوان کانچ کے محدب شیشوں والی عینک چڑھائے ہوئے بول اٹھا۔

"اٹھارہ ہزار؟... میں نے اس زرد رُو تقریباً کرم خوردہ نوجوان کی بوسیدہ صحت والے جسم کی طرف دیکھا۔ اب میری قیمت اٹھارہ ہزار ہے کل تک میں وناسپتی کا ایک ڈبہ ہی خرید سکتا تھا۔ آج ایک موٹر خرید سکتا ہوں

...... اٹھارہ ہزار ....؟

"اٹھارہ ہزار .... اٹھارہ ہزار .... سیٹھ منگھارام اس زرد رو نوجوان کی طرف دیکھ کر چلایا۔ وہ اسے پہچانتا تھا۔ وہ زرد رو نوجوان ملک کے مشہور کروڑپتی سیٹھ چمن لال کا بیٹا مگن لال تھا۔ مگن لال کو نوادرات جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس نے اپنے عالیشان گھر میں ایک عجائب خانہ بنا رکھا تھا۔ جس میں دنیا بھر کے کیور لولا کے جمع کرتا تھا۔ محدب

شیشوں کے پیچھے اس کی ننھی سی آنکھیں گہرے تجسس۔ شوق اور اضطراب سے
چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ لو اَدرات کا دلداز تھا۔

اب سب لوگ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ مگن لال کا مقابلہ ایک امریکی
سیاح سے تھا۔ چارلس ڈولٹل نیو یارک میں سالسٹر تھا۔ ایک کامیاب وکیل
دنیا کے امیر ترین ملک کا شہری...... وہ پیچھے نہیں ہٹے گا......
بیس ۲۰ ہزار!"

"بائیس ۲۲ ہزار!" مگن لال بولا۔

"پچیس ہزار!!" ڈولٹل نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑی لاپرداہی
سے کہا۔

"ستائیس ۲۷ ہزار!" مگن لال اپنی باریک آواز میں اتنے زور سے چلایا کہ مجھے
میں ہر ایک کے چہرے سے مسکراہٹ جھلک اٹھی۔

"تیس ۳۰ ہزار!!" ڈولٹل اپنی ٹھنڈی بھاری آواز میں بولا۔

تیس ۳۰ ہزار؟ میرے ہوش و حواس جواب دینے لگے۔ آخر میں نے کیا کیا
تھا؟ کونسا ایسا تیر مارا تھا؟ کونسی ایسی کڑی محنت کی تھی؟ کس کی بھلائی کے
لئے دن رات ایک کر دیا تھا؟ جس کے انعام میں میری قیمت ایکدم اسقدر
بڑھادی گئی تھی۔ مگر یہ تو ایک عجیب و غریب نامعقول ٹیڑھا سماج ہے۔ یہاں پر
خوبی خامی ہے۔ یہاں اگر آپ سیدھے سچے اور کھرے ہیں، تو آپکی قیمت

ڈالر کے نوٹ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر آپ کی ڈی الٹی ہے اور اسی غائب ہے تو آپکی قیمت تیس ہزار بھی ہو سکتی ہے۔ لوٹ کے ہجے غلط ہوں تو وہ سب سے قیمتی ہے۔ آدمی کے ہجے غلط ہوں تو وہ دفتر سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ سیٹھ منگھارام کے اسٹینو کی طرح۔۔۔۔

"بتیس ہزار!" مگن لال غصے سے چلایا۔

چارلس دو لٹل مسکرایا۔ اس کا مقابلہ ایک دلوانے سے تھا لیکن ایک اس نیلام سے اس کی ساری دلچسپی غائب ہو گئی۔ اور وہ ہلبٹ کر شو کے کسی پرانے بت کو دیکھنے لگا۔ چند منٹ تک سیٹھ منگھارام اسے متوجہ کرنے کے لئے چلاتا رہا۔ اور میری خوبیوں کو بڑھا چڑھا کے بیان کرتا رہا۔ مگر اس امریکی سیاح کا دل مطلق نہ پسیجا۔ آخر اس نے مجھے بتیس ہزار روپوں کے عوض مگن لال کے حوالے کر دیا۔

# تیرہواں باب

چونی لال کی کلکتے میں دو جوٹ کی ملیں تھیں۔ ایک ٹیکسٹائل مل احمد آباد میں تھی۔ ایک بمبئی میں کمانڈ بنانے کا کارخانہ یوپی میں تھا۔ کانپور میں لوہے کی ایک بہت بڑی فاؤنڈری تھی۔ اور اب وہ گوالیار میں رایان کا ایک بہت بڑا کارخانہ کھولنے میں مصروف تھا۔ اسے ایک ہی بات کا غم تھا۔ اسکے بیٹے کے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ مگن لال ابھی تک لاولد تھا۔ اور مگن لال چونی لال کا اکلوتا بیٹا تھا۔

مگن لال اولاد پیدا کرنے کیلئے تقریباً ناقابل تھا۔ تقریباً اس لئے کہ اس کے سارے جذبات مرد کے سے تھے۔ وہ عشق کی آگ اور اسکی حدت کو ایک مرد کی طرح محسوس کرتا تھا۔ مگر اس کا جسم اس کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ وہ محسوس کرتا کہ تخلیق کا ایک شعلہ سا اس کی روح میں لپک رہا ہے مگر اسکی روح اور اس کے شدید احساسات کے گرد اس کا جسم ایک ٹھنڈے، سُن اور برفیلے خول کی طرح اس کے گرد لپٹا ہے اور یہ برف جو کسی طرح پگھلتی نہیں ہے اس کے بھڑکتے ہوئے خوبصورت جذبات کو ناکام بنا دیتی اور وہ ایک زخم

کھائے ہوئے جانور کی طرح اپنی روح کے شدید احساسات اور اپنے جسم کے پر ہول سناٹے کی آویزش سے چیخ اٹھتا۔ ٹھنڈے جسم کے ساتھ اگر روح بھی ٹھنڈی ہو تو کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن فطرت نے اسے ایک شعلہ بجاں روح دیکر اور اسکے گرد برف کا ایک دائرہ کھینچ کر اس سے شدید بے انصافی کی تھی۔ کیونکہ مگن لال کی حسن پرستی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی۔ خوبصورت عورت کو دیکھکر اس کا ذہنی ردعمل وہی ہوتا تھا جو کسی تکمل مرد کا ہو سکتا ہے۔ وہ اسکے ہونٹوں کی بولتی ہوئی دعوت اسے اسی قدر متاثر ہوتا تھا جس قدر کوئی بھی صحت مند اور تندرست مرد متاثر ہو سکتا ہے۔۔۔۔ اپنے اشتعال خیز ان جذبات کے سہارے ڈولتا ہوا جب وہ کسی عورت کے قریب چلا جاتا اور اسے چھونے کی کوشش کرتا تو نہ صرف اس عورت کو بلکہ خود اسے بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ کسی مرد کی انگلیاں نہیں ہیں جو کسی عورت کو چھو رہی ہیں۔ برف کی قلمیں ہیں۔ جن کے لمس سے عورت کے بدن میں بیزاری اور نفرت کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ اور وہ کانپ کر پیچھے ہٹ جاتا۔ دیواروں سے ٹکریں مارتا دو دفعہ اس نے خودکشی بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ناکام رہا۔

پے در پے ناکامیوں کے بعد اب اُس نے اپنی روح کی شعلہ سامانی کو تحلیل کرنے کا ایک راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اس نے اپنی شدید جنسی حس کو ایک شدید جمالیاتی حس میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ عورت کا جسم اس کا نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر خوبصورت تصویریں تو اس کی ہو سکتی تھیں۔ اور سنگ مرمر کے پرکشش

بت جن پروینیس کا شبہ ہوتا تھا۔ کانسی کے نٹ راج کا منجمد خرام . . . اور وہ شمعدان جو
مغلوں کے حرم میں حسن و عشق کی لو کو تیز کرتے تھے۔ ان اشیاء اور کیوپڈ پر وہ
دائمی قبضہ کر سکتا تھا۔ اور ان اشیاء کا حسن ایسا تھا جو اس کی جائیداد کا واحد
وارث تھا اب وہ اگر خوبصورت عورتوں کا حرم نہیں بنا سکتا تھا، تو خوبصورت
چیزوں کا ایک عجائب خانہ کھول سکتا تھا۔ اور یہی اس نے کیا۔ اس نے اپنے محل نما
گھر کا ایک وسیع حصہ ان حسین و جمیل نوادر کو رکھنے کیلئے وقف کر دیا۔ جو وہ دنیا کے مختلف
حصوں سے خرید کر جمع کرتا تھا۔ ہولے ہولے اس کا یہ شوق بڑھتا گیا اور اب وہ ان
نوادر کے خریدنے رکھنے۔ سنبھالنے اور دوسروں کو دکھانے میں ایک لذت معکوس
سی محسوس کرنے لگا۔ اب بھی اس کی بیکراں روح کا کرب اپنی جگہ موجود تھا مگر اب گاہے
گاہے اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے کسی نے اس کے زخم پر پھایا رکھ دیا ہو۔

مگر اس کا باپ ایک عملی آدمی تھا۔ اتنا اس کے لئے کافی نہیں تھا۔ یہ کہ اسکے
بیٹے کے مرنے کے بعد اس کی کروڑوں کی جائیداد دوسرے لوگوں میں بٹ جائے گی
اس کا خیال ہی اس کے لئے سوہانِ روح تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو ٹھیک کرنیکے
لئے طرح طرح کے جتن کئے۔ طرح طرح کے علاج کئے چار بار اسے یورپ لے
گیا۔ جدید سے جدید طریقے آزماتے ہوئے اس نے لاکھوں پھونک ڈالے۔ انہیں میں
ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مگن لال کی شادی کسی حسین لڑکی سے کر دی جائے۔ مگن لال کے
بار بار منع کرنے پر چونی لال نے اپنے بیٹے کی شادی ایک غریب گھرانے

کی مگر انتہائی خوبصورت لڑکی سے کر دی۔

رسنا اس کا نام تھا۔ شباب کا رس اس کی رگوں میں دوڑتا نہیں تھا کھولتا تھا وہ ایک تند و تیز لاوے کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے جسم میں بپھرے ہوئے سمندر کی لہروں کا خرام تھا اسکی نگاہوں میں بجلی کا کوندا تھا۔ اور انگلیوں میں آگ کی لپٹ۔ مگن لال اسے دیکھ کر دیوانہ ہو گیا۔ یکایک اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ رسنا کو اپنی باہوں میں لیکر مکمل مرد بن جائیگا۔

پھر وہ بجھ سا گیا۔ رسنا چند ماہ تو اپنے کھولتے ہوئے جذبات میں کسمساتی رہی ڈھتی رہی، اور لوٹ کر بنتی رہی۔ پھر یکایک وہ پاگل ہو گئی۔ دو سال تک وہ پاگل رہی۔ پھر جب اچھی ہوئی تو وہ بھی بُجھ سی گئی۔ اس کے سسر نے اس محل نما گھر میں اپنی بہو کیلئے ایک مندر بنوا دیا تھا۔ جہاں وہ اکثر اکیلے میں پوجا کر کے اپنا دل بہلایا کرتی تھی اسکی آواز میں ایک عجیب کرب آمیز سنگیت کا رس اتر آیا تھا۔ گھنٹوں وہ رادھا کرشن کی مورتیوں کے سامنے بیٹھی اپنے چھوٹے سے مندر میں بھجن گایا کرتی اور بھجن گاتے گاتے ایک عجیب محویت کے عالم میں بے ہوش ہو جایا کرتی۔ وہ ایک غریب گھر کی لڑکی تھی۔ مگر یہاں اسے زندگی کی ہر آسائش میسر تھی۔ دو گورنسیں اسے بہترین تعلیم اور مغربی آداب سکھانے پر مامور کی گئی تھیں۔ نوکروں کا ایک لمبا چوڑا عملہ تھا جو دن رات اسکی ہر خواہش کو چٹکیوں میں پورا کرنے کیلئے کوشاں رہتا تھا اس پر بھی کئی بار رسنا کا دل یہاں سے بھاگ جانے کو چاہا مگر سونے کی زنجیریں بہت

خوبصورت تخیل۔

رسنا کو شدید طور پر چاہنے کے باوجود اب مگن لال نے اس سے الگ رہنا سیکھ لیا تھا کیونکہ ساتھ رہنے میں شدید کوفت ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سارے جسم و جان کے ریشے ریشے ٹوٹ جائینگے۔ وہ اب اپنے وقت کا زیادہ حصہ اپنے کسوریوں کے ساتھ صرف کرتا تھا۔ ان اشیاء کے ساتھ اس کا ملنا جلنا اسقدر بڑھ چکا تھا کہ اکثر اوقات اکیلے میں وہاں سے گفتگو تک کرنے لگتا۔ اور اسے محسوس ہوتا کہ تصویریں بھی بولتی ہیں اور سنگ مرمر کے یونانی صنم اس سے باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ اب وہ محل کے اس حصے میں بہت کم جاتا تھا جہاں رسنا رہتی تھی۔ صرف دوپہر کے کھانے پر وہ ملتے تھے اور رات کے کھانے پر۔ اور یہ دونوں اوقات بھی اس کے لئے سوہان روح بن جاتے تھے مگر وہ مجبور تھا۔ پتا جی کا حکم تھا اور پھر نوکروں کے سامنے دنیا داری برتنا بھی ضروری ہے۔

جس دن مگن لال نے " مجھے " خریدا وہ اپنی غیر متوقع کامیابی پر اس قدر خوش ہوا کہ یہ خوشخبری رسنا کو سنائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ مجھے ایک نوزائیدہ بچے کی طرح اپنے ہاتھوں میں تھامے۔ رسنا کے بیڈروم میں چلا گیا۔ جو اب دوپہر کی نیند لے کر سنگھار میز کے سامنے اپنے کھلے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ بل کھاتے ہوئے آراستہ بال جو کمر تک جاتے تھے۔ کنگھی اور رسنا کے بالوں کے ملے جلے حسن سے لہراتی ہوئی ناگنوں کی طرح بیدار ہو رہے تھے۔

رسنا اسے یوں غیر متوقع طور پر اپنے بیڈروم میں آتے دیکھ کر چونک پڑی۔

مگن لال بے حد خوش خوش اس کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا ۔
"دیکھو میں نے کیا خریدا ہے ؟" وہ بچوں کی طرح چلا پڑا ۔
رسنا نے "مجھے" دیکھ کر کہا "یہ تو دس روپئے کا ایک نوٹ ہے "۔
"ہاں ہے تو دس روپے کا ۔ مگر میں نے اسے بتیس ہزار میں خریدا ہے "۔
"ایسے باؤلے پن کی باتیں تم اکثر کرتے رہتے ہو"
"یہ باؤلا پن نہیں ہے یہ کوئی معمولی ۔ عام ۔ دس روپلے کا بازاری نوٹ نہیں ہے یہ ایک خاص نوٹ ہے نایاب نوٹ ہے ۔ اس نوٹ کا ثانی سارے ہندوستان میں نہیں ہے بلکہ ساری دنیا میں نہیں ہے آج دوپہر میں نے نیویارک میں ایک ڈیلر کو ٹیلیفون کیا تھا ۔ وہ اس نوٹ کے عوض ایک لاکھ ڈالر دینے کو تیار ہے ۔"
"آخر اس نوٹ میں ہے کیا ؟" رسنا بڑی بیزاری سے میرے چاندی کے فریم کو دیکھنے لگی ۔ اور کانچ پر ہاتھ پھیر کر اور مجھ پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر نگاہ اوپر اٹھا کے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی ۔ استفہامیہ نگاہ سے ۔
"ذرا غور سے دیکھو ! انڈیا کی ڈی الٹی چھپ گئی ہے اور پر اس کی اک غائب ہے "۔ مگن لال نے اسے بتایا ۔
اب رسنا نے غور سے "مجھے" دیکھا ۔ پھر خاموشی سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا "اگر اس نوٹ کی ڈی الٹی ہے اور را ای غائب ہے تو کیا ہوا ! اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں ۔ تمہارے جسم کی ای بھی تو غائب ہے اور ڈی الٹی ہے ۔ پھر میں کیا کروں !"

"اس دس روپے کے نوٹ جسے میں نے تینتیس ہزار میں خریدا ہے۔ آج ایک لاکھ ڈالر مل رہے ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے قیمتی نوٹ ہے۔ آج تمہاری سالگرہ ہے۔ اس موقع پر میں یہ نوٹ تمہیں تحفے میں دیتا ہوں۔"

رسنا نے "مجھے" دیکھا سنگھار میز کے لمبے آئینے میں۔ اپنے بالوں کو اپنی کمر کے نازک خم تک لہراتے دیکھا۔ کمرے کے وسط میں خوبصورت ریشمی چادروں سے سجے ڈبل بیڈ کی طرف دیکھا۔ پھر دلی جلن اور کھولن کی ایک لہر تڑپتی ہوئی اس کے گلابی گالوں تک آئی اور لالا اُسکی آنکھوں میں چمکنے لگا اور اس نے "مجھے" اٹھا کے زور سے فرش پر پٹخ دیا۔ چاندی کا فریم تو نہ ٹوٹا، لیکن کانچ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

وہ شعلہ بار نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی نگاہوں کی نفرت کی کاٹ مگن لال کے دل تک اتر گئی۔ ایک لمحے کیلئے وہ ضرور بھونچکا ہو تھا پھر اس نے آہستہ سے سر جھکا لیا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے چاندی کے فریم کو اٹھا لیا جس میں "میں" جڑا ہوا تھا۔ اور مجھے لیکر کمرے سے باہر نکل گیا۔

رسنا نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ناخنوں سے نوچ نوچ کر اس نے اپنے سارے کپڑے پھاڑ ڈالے اور فرش پر ماہی بے آب کی طرح لوٹنے لگی اس کا سارا بدن جل رہا تھا۔ اور ہلکی ہلکی چیخیں اس کے ہونٹوں سے نکل رہی تھیں یہ چیخیں جو اسکے ان چھوٹے بدن کی کراہیں تھیں۔

پھر اس نے سنگھار میز سے یوڈی کلون کی ایک بڑی بوتل اٹھائی۔

جس کے منہ پر ریشمی ڈوریوں میں بند ربڑ کا فوارہ لگا ہوا تھا۔ ربڑ دبا دبا کر وہ یوڈی کی پھوار اپنے منہ پر اپنی گردن پر، اپنی چھاتیوں پر، اپنے جسم کے مختلف حصوں پر ڈالنے لگی۔ جہاں یوڈی کلون کی پھوار پڑتی تھی، جسم ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔

ان ہی دنوں میں ایک انگریز ڈاکٹر ولیم رشر شہر میں وارد ہوا۔ وہ نفسیاتی طریقے سے علاج کرتا تھا پورے یورپ میں اس کے نئے طریقہ علاج کی دھوم تھی۔ وہ یہاں تین ماہ کیلئے آیا تھا چونی لال نے اپنے بیٹے اور بہو کو اسے دکھایا ولیم رشر کے پاس ڈاکٹروں کی کوئی رسمی ڈگری نہیں تھی۔ اس کے علاج کا طریقہ بھی انوکھا اور عجیب و غریب تھا۔ مگر کئی پرانے مریض حیرت انگیز طریقہ سے اس نے ٹھیک کر دیئے تھے وہ صرف بڑے بڑے لکھ پتی گھرانوں کا علاج کرتا تھا کیونکہ اس کی پہلی فیس ہی پچاس ہزار روپے تھی۔ ظاہر ہے اتنی بڑی فیس کوئی ہملشما تو ادا کر نہیں سکتا۔

مگن لال اور رسنذ کے طبی معائنے کے بعد سیٹھ چونی لال اور ولیم رشر میں دیر تک باتیں ہوئیں... کیا باتیں ہوئیں، یہ کوئی نہیں جانتا۔ مگر بات چیت کے بعد ولیم رشر پھر مگن لال سے ملنے کیلئے اس کے عجائب گھر میں گیا مگن لال سے اس نے

اس کا عجائب گھر کا دیکھنے کی فرمائش کی ۔

دیر تک مگن لال اسے اپنے عجائب گھر کے نوادر دکھاتا رہا۔ کریٹ کی کھدائیوں سے دستیاب کئے گئے نامعلوم بت گروں کے حسین مجسمے ، زہرہ کے مجسمے الفرو داُئتی کے مجسمے ۔ احرام مصر سے چرائے ہوئے فراعین کے زمانے کی ممیاں اور انکے زیورات ۔ مصری کاہنوں کے گلے کے مقدس ہار بھارت ناٹیم ناچتی ہوئی ایک رقاصہ ۔ کالسی کا اور گیارھویں صدی کی دریافت سسلی کے صوری خنجر ، اور چاندی کے فریم میں جڑا ہوا دس روپیہ کا ایک نوٹ جس کی قیمت آج ایک لاکھ ڈالر تک پہنچ چکی ہے ۔

مگن لال کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کو ان نوادر کے سلسلے میں زیادہ واقفیت نہ ہوگی ، مگر لمبے تڑنگے ، مضبوط اور بے داغ جلد والے ، مسکراتے ہوئے ڈاکٹر ژبر کی معلومات بے حد وسیع اور جامع ثابت ہوئیں ۔ ایسا لگتا تھا جیسے آثار قدیمہ کے بارے میں وہ خود کئی سال تک ریسرچ کرتا رہا ہے مگن لال کو اس کی معلومات پر بڑی حیرت ہوئی ۔

ڈیڑھ دو گھنٹے عجائب گھر میں گھومنے کے بعد مگن لال تھک گیا ۔ وہ جلدی تھک جاتا تھا ۔ دوسرے موقعوں پر وہ اس کام کیلئے دو پہیوں والی ایک کرسی استعمال کرتا ۔ مگر آج اس مغربی ڈاکٹر کے سامنے اس نے خود وہیل کرسی پر بیٹھ کر عجائب گھر دکھانا مناسب نہ سمجھا ۔

عجائب گھر دیکھ کے وہ دونوں مغربی کونے کے ایک آرام دہ کیبن میں آ گئے۔ جو مضبوط کانچ کا بنا ہوا تھا۔ جسکی ایک پر میں چاندی کے فریم میں ٹنگا ہوا تھا یہ کیبن مگن لال کا ایک طرح کا دفتر تھا۔ اس کے سوچ بچار کا کمرہ تھا۔ یہیں پر وہ دوپہر میں ایک کونے میں پڑے ہوئے دیوان پر لیٹ کر آرام کر لیتا۔ یہی اس کا گھر تھا۔

اس کیبن میں پہنچ کر مگن لال نے ایک سگریٹ سلگایا۔ ڈاکٹر نے اپنا سگار سلگایا۔ اور چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔

پھر ڈاکٹر بولا "میرا خیال ہے تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے"

"ایں" مگن لال حیرت سے چونک کر تقریباً کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو بیٹھو..."! ولیم رشر کی نیلی اجلی صاف آنکھوں میں ہمدردی کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔

"مگر...؟" اتنا کہکر مگن لال حیرت سے ولیم رشر کی طرف دیکھنے لگا۔ کیسی وجیہہ کھڑی گردن ہے ڈاکٹر کی۔ کس قدر پر اعتماد چہرہ اس کا۔

کیا یہ ڈاکٹر جھوٹ بول رہا ہے آج تک دنیا میں کسی ڈاکٹر نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اسے کوئی عارضہ نہیں ہے۔ ہر ڈاکٹر بس اس کو ذمے دار ٹھہراتا تھا۔ یہ پہلا ڈاکٹر تھا... مگر... ... ... ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

مگن لال حیرت سے ڈاکٹر کے چہرے کی طرف تکے جا رہا تھا۔

ڈاکٹر رشی نے مسکرا کے کہا۔ اس کی مسکراہٹ بھی کس قدر صحت مند اور دلآویز ہے۔ جیسے خوشی اندر سے جھانک رہی ہو۔ سر بھی پینتیس چھتیس سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ مگن لال نے اسے دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔ "سنو مگن! میرا خیال ہے تمہارے جسم میں کوئی نقص نہیں ہے نقص رسنا کے جسم میں ہے "۔

" رسنا میں ؟" مگن لال کی آواز ایک لحنت اونچی ہو گئی۔

" ہاں ہاں ؟" رسنا میں!! چلاؤ نہیں!!! اطمینان سے میری بات سنو۔ میں ٹیکنیکل تفصیلات میں نہیں جا سکتا۔ تم سمجھ نہیں سکو گے۔ موٹے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ تمہارا اعصابی نظام بے حد ذکی الحس ہے تمہیں ایسی عورت کی ضرورت نہیں ہے جو لاوے کی طرح بھرکتی ہو۔ ایسی عورت کا جسمانی ٹمپریچر تمہارے اعصابی نظام کو شل کر دے گا۔ بدقسمتی سے اس عمر میں جس میں رسنا ہے، نوجوان عورتوں کا جسمانی ٹمپریچر بالعموم یہی ہوتا ہے۔ پھر جلد کے اندرونی خلیوں بلکہ جسم کے ہر حصے سے مرد اور عورت کے درمیان الیکٹریکل چارج گذرتے رہتے ہیں۔ وہ مرد اور عورت کے درمیان ایک مخصوص قسم کا جنسی توازن بناتے ہیں۔ اگر وہ الیکٹریکل چارج ایک طرف سے بہت اونچا ہے۔ دوسری طرف سے بہت نیچا ہے تو توازن قائم نہیں ہو گا تمہارا حساس اعصابی نظام دوسری طرف سے آنے والے الیکٹریکل چارج کو برداشت نہیں کرتا۔ مثبت اور منفیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یا نیوٹرل چارج میں

بدل جاتی ہے۔

"مگر وہ دوسری عورتیں.....؟" مگن لال نے فقرہ نا تمام رہنے دیا۔

"بدقسمتی سے نہیں جو عورتیں بھی ہیں..... ہائی وولٹیج VOLTAGE.F والی تھیں۔ ورنہ تمہارے جسم میں کوئی نقص نہیں ہے۔ وہ ایک ذہین اور حساس اعصابی نظام کا مکمل نمونہ ہے۔ میں تمہارے اعصابی نظام میں کوئی تبدیلی لانا پسند نہیں کروں گا۔ مگر میں رسنا کا علاج کرنا چاہوں گا۔ اس کا جسمانی ٹمپریچر بدلنا چاہوں گا اس کی نفسیات کا مطالعہ کرکے، اس کی عادات، خوراک، پوشش میں مناسب تبدیلی کرنا چاہوں گا۔ اس کے جلد کا مطالعہ کرکے اندرون خلیوں کی بایو کیمک بجلی کی رو کو دھیما کرنا چاہوں گا۔ مگر یہ سب کچھ تمہاری اجازت سے تمہاری تحریری اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔"

مگن لال کا دل خلیوں سے اچھلنے لگا بڑی مشکل سے بولا۔

"ڈاکٹر کیا تمہیں واقعی یقین ہے کہ مجھ میں کوئی نقص نہیں ہے؟"

"سو فیصدی!"

"اور رسنا تمہارے علاج سے اچھی ہو جائیگی؟"

"اسکی بھی مجھے سو فیصدی امید ہے۔ رسنا ضرور میرے علاج سے اچھی ہو جائے گی۔ اس میں وقت بھی لگے گا۔ اور مصارف بھی خاصے آئیں گے مگر بالآخر مجھے اس بات کی توی امید ہے کہ رسنا کے جسم کا الیکٹرک توازن میں ضرور ٹھیک

کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

مگن لال نے پُر جوش طریقے سے ڈاکٹر ولیم سے ہاتھ ملایا۔ کانپتی ہوئی پُر امید آواز میں بولا۔

"ڈاکٹر! تم علاج شروع کر سکتے ہو۔"



# چودھواں باب

ولیم رشر رسنا کو کئی بار سینما لے گیا۔ اس کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ رسنا رومانٹک تصویریں بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ زیادہ تر ہیماتی (Horror) پکچرز دیکھنا پسند کرتی تھی۔ ایسی تصویریں جن میں مجنونانہ مار دھاڑ ہو۔ یا پُراسرار ہیبت ماحول ہو۔ یا خوفناک جسمانی اذیت کے ہول نظارے ہوں۔ ایسی تصویروں سے اسے ایک عجیب قسم کا ذہنی سکون ملتا تھا۔

ولیم رشر اسے کئی بار سمندر کے کنارے ٹہلانے لے گیا۔ اور پھر اس کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ رسنا کو خاموش ستا ہوا سمندر پسند نہیں تھا بپھرے ہوئے سمندر کی طوفانی لہریں اسے بے حد پسند آتی تھیں۔

"جی چاہتا ہے میں دوڑ کر ان میں کود جاؤں!" رسنا ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر بولی۔

وہ اس وقت سمندر کے کنارے ایک سنسان ساحل پر کھڑے تھے۔ دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔

"تو کود جاؤ!" ڈاکٹر نے کہا۔

"مجھے تیرنا نہیں آتا۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ کمر تک پانی میں نہاؤ۔ دور تک آگے مت جاؤ۔"

"میں ڈوب جاؤں گی۔" رسنا کانپ کر بولی۔

"میں تمہیں بچا لوں گا۔ مجھے تیرنا آتا ہے۔" ولیم رشر بولا۔ "سارے کپڑے اتار دو اور پانی میں گھس جاؤ۔"

"ہائے! رسنا اکدم خوشی اور ڈر سے بول پڑی۔ "میرے پاس تو بکنی بھی نہیں ہے۔"

"کوئی پرواہ نہ کرو! میں منھ پھیر لیتا ہوں۔ تم کپڑے اتار کے مجھے سمندر میں گھس کے آواز دینا۔"

"نہیں!" رسنا شرماتے ہوئے بولی۔ اس کے گال سُرخ ہو گئے تھے اور تیز ہوا سے اس کے بال بکھر بکھر کر اس کے ماتھے پر آ رہے تھے

ولیم رشر نے اس کے کانپتے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بڑی نرمی مگر بڑی مضبوطی سے کہا۔

"جیسا میں کہوں ویسا کرو! "

"تو تم اپنا منہ ادھر کر لو۔"

"لو کر لیا۔"

دھیرے دھیرے جھجکتے ہوئے رسنا نے سارے کپڑے اتار

ویسے صرف ایک چڈی اور چولی پہنے ہوئے پانی میں گھس گئی۔ اور لہروں سے کھیلنے لگی۔

یکایک ہنسی کا فوارہ سا اس کے منہ سے ابل پڑا۔ وہ چیخ کر بچوں کی سی چنچل آواز میں بولی۔

"تم بھی آجاؤ پانی بہت مزیدار ہے۔"

پانی رسنا کے سارے جسم میں گدگدی کر رہا تھا۔ جھاگ کے سفید سفید بلبلے اس کے سارے جسم کو چوم رہے تھے چاروں طرف پانی کی باہیں۔ وہ اور بھی سمندر کے اندر پانی میں گھس گئی۔

"آجاؤ! سمندر بہت مزیدار ہے!"

"آگے مت جاؤ!" رشی نے اسے تنبیہ کی۔

"میں جاؤں گی۔" رسنا بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے بولی۔

وہ دو قدم اور پانی کے اندر گئی۔

سمندر کی ایک بہت بڑی اچھال یکایک اس کے بدن سے ٹکرا کر لوٹ گئی۔ پانی بہتے ہوئے جذبوں کی طرح اس کے بدن پر سے گذر رہا تھا۔ جھاگ کی سیمیں کترنیں مدار ننھنوں کی طرح اس کے جسم پر رقصاں تھیں رسنا خوشی سے بے اختیار ہنسنے لگی۔ لہریں دور دور تک انگڑائیوں کی طرح ٹوٹنے لگی تھیں۔

کھلا نیلا آسمان رشمی کی آنکھوں کی طرح صاف اور بے داغ، دور دور کہیں کہیں، اونچے لمبے، ناریل کے درخت رشمی کے جوان اور مضبوط جسم کی طرح تنومند اور اکیلے.... سمندر کا پرشور آرکسٹرا اور لہروں کی جوان باہیں۔

رسنا نے دو قدم اور آگے کو لئے اب پانی اس کے کندھوں تک تھا۔

"اب آگے مت جاؤ!" رشمی مسکرا کر بولا۔ اور اپنے کپڑے اتارنے لگا۔ رسنا اسے کپڑے اتارتے ہوئے دیکھ رہی تھی

رشمی نے قمیص اتار دی تھی۔ اس کے سینے کے بھورے بھورے بال ہوا میں ہولے ہولے ہلنے لگے تھے۔ جیسے اوپر پیڑ کی چوٹی پر ہوا ہلتی ہوئی ناریل کی سبز سبز مور پنکھیاں....!

"اپنی آنکھیں بند کر لو" رشمی رک کر بولا۔

رسنا زور سے ہنسی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

یکایک سمندر کی دوسری اچھال آئی۔ اور رسنا کے سر سے گذر گئی جب گذر گئی۔ تو رسنا کا کہیں وجود نہیں تھا۔ صرف گرداب کے تھپیڑے اور کف آلود سمندر۔ چند لمحوں کے بعد قریب کے پانیوں میں رسنا کا جسم رشمی کو پانیوں میں ہاتھ مارتا نظر آیا وہ اچھل کر پانی میں کود گیا۔

"میں ڈوب رہی ہوں!" رسنا یکبارگی زور سے چلائی۔ پھر ڈوب گئی۔

پھر دوبارہ جب ابھری تو رشر کی باہوں نے اسے اوپر اچھال لیا۔ وہ پانی یہ بہت دور گہری نہیں گئی تھی۔ چند لمحوں میں رشر نے معاملے کو سنبھال لیا تھا۔ وہ اب اسے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے ساحل کی طرف لا رہا تھا۔

رسنا پانی کی کلیاں کرتی تھی۔ ڈر سے اس کے سینے سے لپٹی جا رہی تھی۔ خوف سے ہانپتی تھی۔ بچ جانے کی خوشی تھی۔ رشر کی باہیں بہت آرام دہ تھیں۔ اس لئے اسے کچھ برا سا بھی لگا۔ جب صاف خشک ریت پر آکے رشر نے اسے الگ سے لٹا دیا۔

"اٹ واز ..... اٹ واز ..... رِچ ..... اینڈ گو ...!"

(It was tea-go.) وہ ہانپتے ہوئے انگریزی میں بولی۔

نیور! (Never) رشر نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"تم میرے اس قدر قریب تھیں۔ جبھی تو میں نے تمہیں پانی میں جانے کی اجازت دی تھی۔"

رسنا گول گول کنہیاں ریت میں گیلے گڑھے بنا رہی تھیں وہ اپنے بازو سکوڑ کر ان گڑھوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

" اگر میں ڈوب جاتی تو تم کیا کرتے ۔"

" میں سمندر کو آواز دیتا۔ اور لہروں کی اچھال میں تمہارا جسم وینس کی طرح برآمد ہوتا ۔"

" ڈاکٹر رشر!" رسنا بولی ۔

" مجھے دل کہو ۔"

" دل !؟"

" ہوں !؟"

" جانتے ہو تم نے آج میری جان بچائی ہے ۔"

" مگر دل کچھ دیر تک نہیں بولا ۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنے چوڑے سینے پر باندھ لئے تھے ۔ اور آنکھیں بند کرلی تھیں ۔ شاید وہ سو رہا تھا ۔ پھر رسنا بھی نہیں بولی ۔

صرف سمندر دیر تک گرجتا رہا۔ اور کبھی کبھی کانوں میں کوئی سرگوشی کر جاتی تھی کوئی پون گھنٹے کے بعد جب دھوپ کے تولئے نے ان کے گیلے جسم خشک کر دیئے تو رسنا ایک دم چونک کر اٹھی ۔ ڈاکٹر کو اپنے ہاتھ سے جھنجوڑ کر بولی ۔

" اٹھو! گھر نہیں چلو گے کیا ؟"

کپڑے پہن کر وہ دونوں واپس گاڑی کی طرف چلے ۔

یکایک گاڑی میں بیٹھ کے رسنا نے اپنے دائیں کان کی لو کو ہاتھ لگا کے کہا!"۔۔۔ میرے کان کا ایک آویزہ شاید پانی میں ڈوب گیا۔"
"قیمتی تھا؟"

"ہیروں کا تھا؟"

"کوئی مضائقہ نہیں کوئی مچھلی اسے نگل لے گی۔ کوئی ماہی گیر جال ڈال کر اسے پکڑ لے گا۔ کسی دوکان سے کوئی غریب عورت اس مچھلی کو خرید لے گی اور جب اس کا پیٹ چاک کرے گی تو وہ دمکتا ہوا ہیرے کا بندہ ایک معجزے کی طرح برآمد ہو گا۔"

رسنا زور سے ہنسی "دل! تم بھی کتنی دلچسپ بات کرتے ہو۔ ایسی باتیں، تو میرے شوہر نے آج تک کبھی مجھ سے نہیں کیں۔"

دل بڑی سنجیدگی سے بولا "شوہر ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔"

اس نے بٹن دبا کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

جب گاڑی اسٹارٹ ہو کر چلنے لگی تو دور چٹانوں کی اوٹ میں چھپا ہوا مگن لال دیر تک گردن گھما کے نیم دائرے میں گھومتی ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہا۔ پھر جب گاڑی موڑ سے غائب ہو گئی تو اس نے پھر آنکھیں سمندر کے پانیوں پر جما دیں۔ جس میں اس کی بنسی کی ڈور پڑی تھی۔

دیر تک وہ بنسی کی ڈور کو ہلائے بغیر سمندر کے پانیوں کو

دیکھتا رہا۔

بہت رات گئے مگن لال اپنے عجائب گھر میں گھومتا رہا۔ آج اس نے شدید مصروفیت کا بہانہ کر لیا تھا۔ اور رات کے کھانے پر بھی نہ آیا تھا۔ اپنا کھانا اس نے اپنے عجائب گھر میں منگوا لیا تھا کھانا کھا کے اور فریخ کو نیاک کے دو چھوٹے چھوٹے جام پی کر وہ شینی کے مجسمے کو اس کے بکسے بیں سے کھولنے لگا۔ یہ بکسا آج ہی لندن سے بذریعہ ہوائی جہاز پر آیا تھا۔ بکسے میں شینی کا مشہور مجسمہ پیک تھا۔ اس مجسمے کا نام تھا "انگڑائی"۔ . . . ایک عورت انگڑائی توڑ رہی تھی۔ مگن لال بڑی بیقراری سے مجسمے کو بکسے میں سے نکالنے لگا۔

بہت رات گئے کھانا کھا کے بھی رسنا اور ولیم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پہلے کھانے کے کمرے میں۔ پھر ڈاکٹر کے کمرے میں۔ جو رسنا کے کمرے سے لگا ہوا تھا۔ دل کے ہاتھوں پہلی مرتبہ رسنا نے تھوڑی سی پورٹ چکھی۔ وہ پیتی نہیں تھی۔ مگر دل نے اصرار کیا کہ یہ بھی علاج میں شامل ہے۔ شوپان کی دھیمی دھیمی موسیقی ریکارڈ پر چل رہی تھی رسنا

کی آنکھوں میں کیف و سرور چھلکنے لگا۔ نیم غنودگی کے نشے میں بولی... "مجھے نیند آرہی ہے۔"

"تم اپنے کمرے میں جاؤ! میں ابھی آتا ہوں۔"

"رسنا نے چونک کر کہا۔ تم کیوں آنے ہو؟"

"تمہارے جسم پر مالش کروں گا۔"

رسنا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شیشم کا سیاہ عورت کا بُت، قیامت خیز انگڑائی کے پوز میں تھا۔ مگن نے اسے ایک کونے میں کھڑا کرکے اسے چاروں طرف سے غور سے دیکھا۔ بالکل بے عیب، بے نقص، حد درجہ ہیجان انگیز..... وہ ایک نرم بڑدار کپڑا لے کر اس سیاہ بت کے اعضا کو چمکانے لگا۔ مگن نے اپنے ریکارڈ پر ایک اداس رومانی دھن کا ریکارڈ لگا دیا تھا۔ پتھر کے بت کے سڈول اعضاء بڑدار کپڑے پر لگے ہوئے پالش سے ہولے ہولے چمکنے لگے۔ مگن نے بڑدار کپڑا نیچے رکھ دیا اور اپنے ہاتھ اس بت کی باہوں پر پھیرنے لگا۔

اس کا اور میرا ٹمپریچر کتنا ملتا ہے۔ یہ پتھر کی ہے میں برف کا ہوں۔

بجلی نہ اس میں ہے نہ مجھ میں ......؟"

ڈاکٹر رشر نے رسنا کے بیڈ روم میں دو ایئر کنڈیشنر لگوائے تھے اس وقت اس نے ان کا ٹمپریچر درست کیا تھا۔ بتیاں بہت دھیمی کر دی تھیں اور اب وہ انتہائی سنجیدگی سے اپنی قمیض کی آستین اوپر چڑھائے ہوئے رسنا کی پیٹھ پر بادامی رنگ کے ایک مرہم سے مالش کر رہا تھا اس کے سدھے ہوئے مشاق ہاتھ پاؤں کی پوروں سے کمر کے خم تک جاتے تھے اور مالش کے دائرے بناتے ہوئے لوٹ آتے تھے رشر نے رسنا کو بتایا تھا کہ اس مالش کا اثر جلد کے اندرونی خلیوں تک پہنچ کر دھیرے دھیرے رسنا کے اعصابی نظام کو درست کر دیگا۔

ڈاکٹر رشر، کمر سے کندھے تک پہونچا۔ اب وہ ڈبل بیڈ کے ایک کنارے کھڑا ہو کر رسنا پر جھک کر اس کے کندھوں اور گردن پر مالش کر رہا تھا۔

....... مگر رسنا کا اعصابی نظام ٹھنڈا ہونے کے

بجائے اس کے جسم کے رگ و پلے میں چنگاریاں بھر رہا تھا
دھیرے دھیرے وہ سلگنے لگی۔ پاؤں کی پور سے لیکر گردن
کے خم تک وہ اپنے بدن میں بجلی کی ایک تیز رو کو دوڑتی ہوئی
محسوس کر رہی تھی۔ پھر بھی وہ دانت پیس کر دم سادھے
ہوئے پڑی رہی ............ ہے بھگوان .....
..... یہ بہت مشکل ہے ....... اس نے جلدی
سے بالوں کی ایک لٹ اپنے منہ میں دبا لی۔ اس کے نتھنے
پھولنے لگے تھے۔ اور سانس زور زور سے چلنے لگی تھی۔

رستا نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا
تھا...... کل وہ یہ مالش نہیں کرائے گی۔ صاف
انکار کر دے گی۔

ہولے سے ڈاکٹر رشر نے اس کے بالوں کی لٹ اس
کے منہ سے نکال لی۔ اب اس کے مرہم سے چکنے ہاتھ اس کے
بالوں میں تھے ..."ناں ..ناں .... میرے بالوں کو مت
چھوڑو" رستا نے اپنے دل میں کہا" مگر کچھ بول نہیں سکی اس کا دم رکنے لگا
رشر کے ہاتھ بالوں کے اندر کی جلد کو سہلاتے ہوئے بالوں کی ایک ایک
لٹ کو سنوارتے ہوئے رشر کو ایسا لگا جیسے وہ شعلوں میں کنگھی کر رہا ہے۔

یکایک کروٹ بدل کر رسنا اٹھی ۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں اور ہونٹ ذرا سے کھلے ہوئے ۔ اس نے غیض و غضب کی ایک تیز نگاہ رنبیر پر ڈالی ، اور اپنے دونوں بازوؤں سے اس کی گردن کو جکڑ کر دیوانہ ر . . سے مہر نوچنے تھی ۔

........ دل ........ میرے دل...

.....!! میرے ! میرے ! میرے دل ۔

عجائب گھر میں مگن دونوں ہاتھوں سے اس سیاہ بُت کے پاؤں پکڑے ہوئے رو رہا تھا ۔ دھیرے دھیرے کونے میں ریکارڈ چل رہا تھا ۔

آج سجن مورے انگ لگے ہیں

سہیل بھجو مم دھیا —— !

# پندرھواں باب

دن گذرتے گئے۔ مگن زیادہ سے زیادہ اپنے عجائب گھر میں محصور ہوتا گیا۔ محل نما گھر کا زنانہ حصہ رسنا کے کھلے مسرت آمیز قہقہوں سے معمور ہوتا گیا۔ اس کی چال میں زیادہ لچک آگئی، اور آنکھوں میں شراروں کی چمک کی جگہ ایک اجلی نکھری دھوپ نے لے لی تھی۔ ایسی دھوپ جو ساون کی گھٹا برس جانے کے بعد آتی ہے اب رسنا ہر وقت گنگناتی رہتی۔ اس پر غش کے دورے بھی نہیں پڑتے تھے کئی کئی دن وہ مندر بھی نہیں جاتی تھی۔

تین ماہ بعد ڈاکٹر دنتر انگلینڈ چلا گیا اس کے جانے کے بعد چھ ماہ بعد رسنا کے یہاں بچہ ہوا کروڑ پتی خاندان کا وارث پیدا ہو گیا۔ دادا کی خوشی

کی کوئی انتہا نہ تھی ۔ دان پُن کرنے کے لئے اس نے اپنی ہتھیلیوں کا منہ کھول دیا۔

پہلی بار جب مگن نے اپنے بچے کو دیکھا تو دیر تک خاموشی سے دیکھتا ہی رہ گیا ... دستا نے ابھی آنکھیں بند کر لی تھیں ...... اس کا چہرہ ایک مکمل نقاب تھا۔ ڈاکٹر اور دو نرسیں قریب کھڑی اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ دادا بھی اسی کمرے میں ایک طرف کھڑے اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

بچہ بہت خوبصورت تھا۔ گلابی گلابی پھولے پھولے گال، اور ان کے اوپر نیلی نیلی آنکھیں اور شفاف دودھیا ننھے ننھے ہاتھ پاؤں۔ پالنے میں پڑا خوشی سے ہمک رہا ہے۔

مگن نے جھک کر اس بچے کو گہری سنجیدگی سے اپنی باہنوں میں اٹھایا۔ اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا۔ اس کے ماتھے پر ایسے بوسہ دیا۔ جیسے وہ ایک صلیب کو بوسہ دے رہا ہو۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے بچے کو پالنے میں واپس رکھ دیا۔ اور چپ چاپ کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا ...؟

دوسرے سال ڈاکٹر رشر پھر علاج کے لئے آیا۔ آیا تو تھا دو ماہ کیلئے مگر دستا نے اصرار کر کے مزید تین ماہ کیلئے روک لیا۔ اس کے جانے کے سات ماہ بعد پھر ایک لڑکا ہوا پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت اور

تندرست ۔۔۔ ؟!

دوسرے بچے کی زچگی سے فارغ ہو کر رسنا بھی تبدیلی آب وہوا کے لئے سوئٹزر لینڈ چلی گئی ۔ اپنے دونوں بچوں کو لیکر ۔ اس کا ارادہ چند ماہ کے لئے یورپ میں سیاحت کا تھا ۔ کروڑ پتی سیٹھ نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس قیام کے دوران میں ڈاکٹر رشر پورے وقت رسنا کے ساتھ رہے گا ۔ اور ہر دم اس کی صحت کا خیال رکھے گا ۔

جب رسنا یورپ چلی گئی ۔ تو اس کے چند روز بعد ایک رات مگن لال اپنے باپ کی خوابگاہ میں گیا ۔ اور اس سے کہا ۔

" اب جبکہ آپ کے خاندان کے دو وارث پیدا ہو گئے ہیں ۔ بلکہ ممکن ہے تیسرا بھی ہو جائے ۔ میں یہاں سے جانا چاہوں گا " ۔

" جہاں چاہو جا سکتے ہو ۔ میں نے آج تک تمہاری کونسی خواہش پوری نہیں کی ہے ؟ " سیٹھ چونی لال نے اس سے کہا ۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ " میں تو چاہتا تھا کہ یورپ کے سفر پر تم بھی رسنا کے ساتھ جاتے مگر تم نے خود ہی انکار کر دیا ۔ اب کہاں جانا چاہتے ہو ؟ "

" آپ سمجھتے نہیں ہیں " ۔ مگن لال نے اپنے باپ سے کہا " میں نے اس گھر کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے " ۔

"کسی دوسرے گھر میں رہنا چاہتے ہو؟"

"نہیں ...... مجھے ......!" مگن ڈرک رک کر کہنے لگا۔ "میں دراصل اس گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے ایک پیسہ بھی نہیں لینا چاہتا۔ صرف چند چیزیں لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور پھر کبھی آپ کو صورت نہیں دکھاؤں گا۔"

"مگر کیوں۔"

"وجہ آپ جانتے ہیں۔"

سیٹھ چونی لال دیر تک چپ رہا۔ پھر کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔

"احمق مت بنو! تم اگر میری جگہ ہوتے تو یہی کرتے۔ جانتے ہو ہمارا خاندان، ہندوستان کے پہلے تیئس خاندانوں میں سے ہے۔ دولت اور طاقت کے اعتبار سے یہی تیئس خاندان ہندوستان پر حکومت کرتے ہیں۔ وزیروں کے نام اور عہدے بے شک بدلتے رہتے ہیں مگر دراصل حکومت ہماری ہے۔ تم کیا جانتے ہو!؟ میں اس طاقت اور دولت کو لاوارث چھوڑ دیتا؟ اور اپنے دشمنوں کے ہاتھوں میں جانے دیتا؟"

"وہ بچے میرے بچے نہیں ہیں .... اور اب وہ بیوی بھی میری

بیوی نہیں ہے "۔

" اس طرح سے تو یہ دولت جو ہم نے گذشتہ سو سال سے اکھٹی کی ہے۔ دراصل ہماری نہیں ہے۔ اخلاق کے ایسے کھوکھلے اصول اسٹیج پر اور مذہبی کتابوں میں بڑے اعلےٰ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر زندگی میں ان کا کیا کام ....؟ تمہارے آباد اجداد اگر ان اصولوں پر چلتے تو آج ہم دونوں فٹ پاتھ پر ہوتے۔ احمق مت بنو!"

مگن نے بڑے غصے سے اپنے شانے اچکائے۔

اس کے باپ نے مگن لال کو شانے سے پکڑ کر قریب کی ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ خود پلنگ پر بیٹھا تھا۔ کرسی اور پلنگ کے بیچ میں ایک چھوٹی سی تپائی تھی۔ جس پر اس کے دونوں خوبصورت پوتوں کی تصویریں کیبنٹ سائز کے فریم میں جڑی رکھی تھیں۔

سیٹھ چونی لال کا ہاتھ دیر تک ان دونوں بچوں کے فریم سے کھیلتا رہا۔ اس کی حسین انگلیاں کبھی ایک فریم پر جاتیں کبھی دوسرے فریم پر۔ آخر اس نے نگاہ اٹھا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اور تصویروں کی طرف اشارہ کر کے تیز نشتر کے انداز میں بولا۔

" ایک دن میں بھی اسی طرح پیدا ہوا تھا۔

اس نے وہ دنیا چھوڑ دی تھی ۔ اور اب اکیلا شہر کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ آتے وقت اس نے اپنے ساتھ کچھ نہیں لیا تھا۔ صرف چاندی کے اس چھوٹے سے فریم کو جس میں ماں بند تھا۔ اٹھا کر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اس کی جیب میں صرف چند آنے تھے، اور وہ اسی طرح گھر سے نکل آیا تھا، چوروں کی طرح ۔ باپ کو بتائے بغیر۔ کوئی چٹھی چھوڑے بغیر۔ مگر اب اس نے یہ بالکل فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس گھر میں کبھی واپس نہیں جائے گا۔

وہ کیسے اپنی زندگی بسر کریگا؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا...

وہ کیا کام کر سکتا ہے ؟ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔ دراصل آج تک، جس دن سے وہ پیدا ہوا، اس نے کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس کا سارا جسم آجتک مکمل بیکار رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں، دل و دماغ، رگ ریشے سبھی پٹھے، سب بیکار رہے تھے نہ زندگی بھر چاندی کے چمچوں سے اسے دودھ پلایا

گیا تھا۔ بے بہار کے انگوری دالوں کی طرح اسے ہمیشہ روئی اور ریشم اور سنجاب میں لپیٹ کر رکھا گیا۔ اسے اپنے جسم کو کبھی ٹھیک سے استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا۔

کچھ بھی ہو، وہ کبھی واپس نہیں جائیگا۔

دیر تک وہ سڑکوں پر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ بے مقصد آوارہ وہ گھومنا چاہتا تھا۔ وہ چلتے رہنا چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا اگر وہ کہیں رُک گیا تو کہیں واپس نہ چلا جائے اپنی زندگی میں آج تک کبھی اتنا نہیں چلا تھا۔ محض چند قدم چلا تھا۔۔۔ پورچ سے گاڑی تک۔ دکان سے فٹ پاتھ تک۔ لفٹ سے برآمدے تک۔ بس پیدل چلنے کیلئے یہی چند قدم اسے یاد تھے اس کے سارے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ چلتا گیا۔

رات کے گیارہ بجے وہ تھک کر سدانند روڈ کے ناکے پر ایک بارہ منزلہ اونچی مگر نامکمل بلڈنگ کی ہر روڑی اور بجری کے ڈھیر پر سو گیا۔ سامنے سے سمندر کی کھلی خوشگوار جھونکے آرہے تھے۔ وہ کمر سیدھی کر کے پاؤں پھیلاتے ہی سو گیا۔

کب تک سوتا رہا اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ یکایک کسی نے اسے زور سے جھنجوڑ کر جگایا۔ ہڑبڑا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ تیز دھوپ کی روشنی اس کی آنکھوں میں بھالے کی طرح چبھ گئی۔ وہ پلکیں جھپکاتے آنکھیں ملتے جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

# سولھواں باب

ایک کسی ہوئی تنو مند سیاہ عورت ، بجری کی ٹوکری اٹھائے ،
اس کے سر پر کھڑی تھی۔ مگر پہلے نہ صرف اس نے ، اسکی ننگی سیاہ پنڈلیاں دیکھی
تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ ایکدم چونک گیا ۔ شیبنی کا بت . . . . جلدی سے اسکی نگاہ اوپر گئی۔

"اے بابو اٹھ ! کب تک سوتا رہے گا ؟"

اس کے سفید دانت بجلی کی طرح چمکے ۔

اتنا کہہ کر اس نے ڈھیر سے ٹوکری میں بجری بھری اور ٹوکری اٹھا
کے اس جواب کا انتظار کے بغیر بلڈنگ کی طرف چلی گئی ۔ وہ دیر تک اسکی لچکتی کمر
اور ڈولتی چھاتیوں کی طرح حیرت سے دیکھتا رہا ۔ کیا شیبنی
نے اس عورت کو دیکھ کر وہ کالا بت بنایا تھا ۔ ؟

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنے دونوں بازو اس نے ٹانگوں پر باندھ لئے، اور گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی کو ٹکا لیا۔ اور اس عورت کو دیکھنے لگا۔ جواب پھر بجری اٹھانے کے لئے اس کے قریب آرہی تھی۔

وہ بولی ..... "اب گھر جاؤ"۔

وہ بولا ........ "گھر تو چھوڑ دیا"۔

"تو دھندے پر جاؤ!"

"میں کوئی دھندا بھی نہیں جانتا" وہ افسوس سے سر ہلا کے بولا۔

"تو اب تک کیسے زندہ تھے؟"

"زندہ بھی تھا کہ نہیں، اس میں شبہ ہے"

"عجب آدمی ہو۔" سیاہ عورت نے حیرت سے سر ہلایا۔ اس کی ایک جھمکتی ہوئی لٹ اڑ کر رخسار سے نیچے گر کر ہل رہی تھی۔ اس نے بالکل سے اسے کس کر جوڑے میں باندھ لیا۔ پسینے میں اس کا جسم چمک رہا تھا۔

"مجھے پیاس لگی ہے" مگن لال نے اپنے خشک ہونٹوں پر اپنی خشک زبان پھیری۔

"وہ ادھر سمنٹ اور بجری مکس کرنے کی جاگہ پر پانی کا نل ہے جلدی

سے جا کے پی لے ۔"

وہ پی کے آیا۔ پھر وہیں بجری کے ڈھیر پر بیٹھ گیا ۔

" تم جاتے کیوں نہیں ؟" اس سیاہ عورت نے پھر ٹوکری میں بجری بھرتے ہوئے کہا ۔

" بھوک لگی ہے ۔"

" بھوک لگی ہے تو کوئی کام کرو !" وہ ٹوکری اٹھا کے پھر چلی گئی ۔

جب واپس آئی تو لگن لال نے کہا ۔

" مجھے کوئی کام دلوا دو !"

" کیا کام کر سکتے ہو !"

" جو تم کر سکتی ہو ۔"

" میں تو بجری کی ٹوکری اٹھاتی ہوں ۔"

" میں بھی اٹھالونگا ۔"

وہ اس کے زرد زرد چہرے اور اس کے دبلے پتلے جسم کو دیکھ کر ہنسی ۔ کچھ کہا نہیں ، اس نے ٹوکری اٹھا کے چلی گئی ۔ پھر جو واپس آئی تو سفید بالوں اور سفید مونچھوں والے ایک بڈھے کو ساتھ لیکر آئی ۔

گمن کو دیکھ کر اس سفید مونچھوں والے بڈھے کے چہرے پر ایک تبسم آیا۔ بولا! "اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ!"

گمن اٹھ کر بجری کے ڈھیر پر کھڑا ہو گیا۔

بڈھے نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر بولا "کام کرے گا؟"

"کرے گا۔"

"ادھر مرد لوگ کو ڈیڑھ روپیہ روز ملتا ہے عورت لوک کو ایک روپیہ ملتا ہے۔ تمہارا شریر بہت دبلا ہے۔ جنالی کے مانک ہے۔" وہ ہنسا! "تم کو صرف ایک روپیہ روز ملے گا چلے گا"؟

"چلے گا۔"

"تو اٹھاؤ ٹوکری اور بجری بھرو!"

دن بھر وہ بجری بھرتا رہا۔ پہلی بیس۲۰ پچیس۲۵ ٹوکریوں میں اسے کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ پھر ہولے ہولے تو اوشل ہونے لگے۔ ٹوکری بھاری معلوم ہونے لگی۔ جسم سے پسینہ پھوٹ کر بہنے لگا۔ سورج کی کرنیں اس کے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھنے لگیں۔ اسے بار بار پیاس لگنے لگی۔ ہاتھ پاؤں بھاری محسوس ہونے لگے۔ جیسے اس کی رگوں میں خون کے بجائے پگھلا ہوا سیسہ بہہ رہا ہو۔ پھر بھی وہ دانت بھیں کر دن بھر ٹوکری اٹھاتا رہا۔ دن میں دس

مرتبہ اسے خیال آیا کہ وہ ٹوکری پھینک کر چلا جائے۔ سڑک پر سے
گزرتی ہوئی کسی ٹیکسی کو آواز دے کے روک لے اور سیدھا اپنے
عیش و فراغت کے گہوارے میں واپس چلا جائے مگر وہ دانت
پیس کر کام کرتا رہا۔ شام کو جب اسے چھٹی ملی تو وہ اس بجری کے ڈھیر
پر خالی ٹوکری پھینک کر ہانپتا ہوا لیٹ گیا۔ شام کی سمندری ہوا
ہولے ہولے اس کے جسم کا پسینہ خشک کرتی گئی۔ اسے نیند سی
آنے لگی۔ اسے اپنے جسم میں انتہائی نقاہت سی محسوس
ہو رہی تھی۔ اسے معلوم بھی نہیں ہوا۔ کب اس کی آنکھیں بند
ہو گئیں، کب وہ سو گیا؟ ایکا ایکی رات کو کسی نے اسے جھنجوڑ کر
جگایا۔

وہ کالی عورت اس کے سر پر جھکی ہوئی کہہ رہی..." اٹھو کھانا
کھا لو۔ کیا بھوکے ہی سو جاؤ گے؟"

اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سمندر تاریک ہو چلا تھا بارہ
منزلہ نامکمل بلڈنگ ایک خوفناک دیو کی طرح منہ پھاڑے کھڑی تھی
اس کے قدموں میں مزدوروں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں آگ جلائے کھانا کھانے میں
مصروف تھیں آوازیں، گالیاں، ہنسی، عورتوں کی چہکاریں، ننگ دھڑنگ
کالے بچے آدھی چپاتی ہاتھ میں لئے جبڑے چلاتے ہوئے۔

ایک موٹی چپاتی پر اس کالی عورت نے تھوڑا سا ساگ رکھ دیا۔ پہلے تو مگن کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس کا کیا کرے؛ وہ چھری کانٹوں سے کھانے کا عادی تھا۔ اور کوئی طریقہ اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ مگر اب اسے بھوک بھی زوروں سے لگ رہی تھی۔ اس نے چپاتی کو توڑ توڑ کر بڑی سنجیدگی سے ایک سا سینڈوچ بنایا اور اسے بڑی ادا سے کھانے لگا۔ سیاہ عورت مسکرا کر اسکی طرف دیکھتی رہی کھا کر اس نے کہا: "ایک چپاتی اور دو!"

"نہیں!" وہ بولی "آج کل راشن مہنگا ہے۔ پہلے ہم دو چپاتی کھاتے تھے۔ اب ہم سب لوگ ایک چپاتی کھاتے ہیں"

"مگر مجھے بہت بھوک لگی ہے!"

"تو نل سے جیادا پانی پی کر سو جاؤ۔ پر دوسری چپاتی نہیں ملے گی"

نل سے پانی پی کر وہ پھر اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔ پر اب اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ آسمان پر تارے کھلے ہوئے تھے۔ وہ دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کروٹ بدل کر اپنے قریب لیٹی ہوئی سیاہ عورت کو دیکھا۔ وہ ابھی اپنی کھلی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" مگن نے اس سے پوچھا۔

"تُلسی" وہ بولی۔

"تمہارا گھر والا کدھر ہے!"

"میں نے اپنے گھر والے کو چھوڑ دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"دارو پیتا تھا۔"

"کوئی بال بچہ؟"

"ایک لڑکی تھی، تانی مر گئی۔"

دیر تک وہ چپ رہا........ دیر تک وہ چپ رہی...
...... ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آتے رہے، اور مگن کے بدن کو گدگداتے رہے۔ تلسی نے اپنے دونوں بازو اپنی چھاتیوں پر باندھ لئے تھے اور لیٹا ہر آسمان کو دیکھنے میں منہمک تھی۔ پھر وہ اچانک بولی۔

"تمہارا نام؟"

"مگن۔"

"گھر والی؟"

"وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے؟"

"کوئی بال بچہ؟"

"کوئی نہیں۔"

پھر رات بھر تلسی نہیں بولی۔ مگن بھی تارے گنتے گنتے سو گیا۔ صبح

جب اٹھا، تو اس کا سارا جسم تپ رہا تھا۔ اور سارا جسم دکھ رہا تھا۔ پر اس نے تلسی کو کچھ نہیں بتایا۔ ٹوکری اٹھا کے دن بھر کام کرتا رہا۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کام کرتے کرتے اس کا دم نکل جائے گا۔ مگر پھر بھی دانت پیس کر وہ کام کرتا رہا۔ شام کو بالکل بے دم ہو کر زمین پر بے سدھ پڑ گیا۔ رات کو تلسی نے اسے جگایا وہ ہاتھ میں تھالی لئے اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اور اس کی طرف ہمدردی بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں تو بخار ہے"

"یونہی سا ہے"

"کوئی دوا لو گے؟"

"نہیں ......... کل تک ٹھیک ہو جاؤں گا"

"اٹھو! کھانا کھا لو ..... آج تم کو دو چپاتیاں ملیں گی"

تلسی نے تھالی اس کے سامنے رکھ دی۔ اپنا کھانا اس میں سے اٹھا لیا۔

"تم تھالی لے لو" میں اپنی چپاتیاں ہاتھ میں رکھ

کر کھاؤں گا۔"

"نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ تم تھالی لے لو نا" تلسی نے اصرار کیا۔

مگن نے تھالی میں کھانا کھا لیا ۔ ۔ ۔ کھانا کھاتے ہی وہ سو گیا کچھ تو بخار تھا۔ کچھ تھکن ، بالکل بے سدھ ہو کر سو گیا۔ رات کو تلسی دو ایک بار اٹھی ۔ اس نے مگن کو بجری کے ڈھیر پر بالکل بچوں کی طرح سوتے دیکھا ۔ گول گیند کی طرح گھٹنوں میں اپنا منہ چھپائے ہوئے تلسی نے اپنا پرانا بوسیدہ مگر گرم لحاف اس پر ڈال دیا بہت صبح سویرے جب مگن کو پیاس لگی تو اس نے تلسی کے لحاف کو اپنے جسم کے اوپر دیکھا۔ قریب میں تلسی بے خبر سو رہی تھی ۔ تارے ماند پڑ رہے تھے ۔ بارہ منزلہ بلڈنگ کے نامکمل ۔ دروازوں ۔ کھڑکیوں کی خالی مستطیلوں میں سے روشنی چھن کے آ رہی تھی ۔ اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بخار کل سے بھی تیز تھا۔ اور تھلیاں بجری اٹھا اٹھا کر سوج گئی تھیں ۔

آج اسے کام کرتے ہوئے بے حد تکلیف ہوتی رہی ۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کا جسم لکڑی کے جوڑوں سے بنا ہے یا مشین کے زنگ کھائے ہوئے پرزوں سے۔ آج وہ بہت جلد ہانپ جاتا ہے۔ آنکھوں کے آگے ترمرے سے ناچنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی سارا آسمان لال ہو جاتا ہے۔ سر میں چکر آتا ہے ۔ تلسی نے اسے کام کرنے سے منع

گیا۔ مگر وہ نہ مانا۔ گرتا پڑتا کسی نہ کسی طرح سے دن بھر ٹوکری ڈھوتا رہا۔ شام تک خود بخود اس کا بخار کم ہو گیا۔ بدن ہلکا ہلکا سا لگنے لگا۔ دوسرے دن بخار اور بھی کم ہو گیا۔ تیسرے دن آپ ہی آپ ٹوٹ گیا۔ کوئی دوا کئے بغیر مگر ہاتھوں کی بری حالت ہو چکی تھی۔ ٹوکری ڈھوتے ڈھوتے کھال تک ادھڑنے لگی تھی۔ تیسری رات یہ حالات ہو گئی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا بھی نہیں کھا سکتا تھا۔

"میرے قریب آؤ۔ میں تمہیں کھلا دوں"۔

"نہیں!" مگن نے سر ہلا کر انکار کیا۔ مگر روٹی اٹھا کر جو لقمہ توڑنا چاہا۔ تو لقمہ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔

"ادھر آؤ!" تلسی گرج کر بولی اور اس نے مگن کی تھالی کو اپنے قریب سرکا لیا۔۔۔۔۔۔ مگن اس کے قریب چلا گیا۔

وہ ایک لقمہ توڑ کر اس کے منہ میں دیتی۔ دوسرا لقمہ توڑ کر اپنے منہ میں رکھتی۔ دونوں جبڑے چلاتے ہوئے مسرور نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تلسی کی آنکھیں تاراسی چمک رہی تھیں اور مگن کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے روح کے گرد جمی ہوئی برف کا دائرہ ہولے ہولے پگھل رہا ہے

ہے۔ اس کی روح کے گرد جمی ہوئی برف کا دائرہ ہوتے ہوتے پگھل رہا ہے
کھانا کھلا کے اور تھالی برتن صاف کر کے تلسی نے کہیں سے تیل
کی ایک چھوٹی سی شیشی نکالی، اور مگن کے ہاتھوں کو دھیرے دھیرے چپڑنے
لگی۔ تیل چپڑ کر اس نے اپنی ایک بے حد پرانی اور بوسیدہ ساری نکالی۔
اور اس کی دھجیاں پھاڑ پھاڑ کر اس نے مگن کی دونوں ہتھیلیوں کو باندھ دیا
دوسرے دن مگن انہیں دھجیوں سے بندھی ہاتھوں سے ٹوکری اٹھا
اٹھا کے کام کرتا رہا۔ اگلے چار پانچ دنوں میں اس کے ہاتھوں کے زخم
بھر گئے۔ سوجن غائب ہو گئی..... ہاتھوں میں سخت گٹے پڑ گئے۔ اب وہ
بغیر کسی تکلیف کے اپنے ہاتھوں سے بجری بھر سکتا تھا۔ اس کے جسم کی
زردی ہوتے ہوتے دور دور ہوتی گئی۔ جسم کالا پڑتا گیا۔ کھلی دھوپ، کھلی
ہوا اور رات کی کھلی فضا سے اس کے جسم میں ایک نئی طاقت دوڑنے لگی۔
اگلے پندرہ بیس دن میں وہ اتنا اچھا کام کرنے لگا کہ سفید مونچھوں والے
بڈھے نے اُسے ترقی دے کر اُسے مردوں کے گریڈ میں رکھ دیا۔ اب، اُسے
ڈیڑھ روپیہ روز ملنے لگا۔ وہ تلسی کو دن کے کھانے کے پانچ آنے اور رات
کے کھانے کے چھ آنے دیتا تھا۔ دو آنے کی چائے پیتا تھا۔ کبھی چار آنے کی۔
باقی پیسے وہ تلسی کے پاس ہی رکھ دیتا تھا۔ اُس کے جوتے ٹوٹ گئے تھے پتلون
پھٹ کر نیکر بن گئی تھی اور گھٹنوں سے ذرا نیچے جھنڈوں کی طرح لٹک،

رہی تھی . . . . مگر وہ خوش تھا ۔

چند دن بعد تلسی اس کے لئے بھورے رنگ کی ایک لنگی لے آئی اس نے

اُسے اپنی نیکر نما چیتھڑوں والی پتلون اتار کر اُسے وہ لنگی پہننے کو کہا پہلے تو

مگن نے انکار کیا۔ مگر تلسی کا چہرہ دیکھ کر وہ مان گیا۔ آج وہ خوب نہایا۔ پہلی

بار تلسی نے اس کے کپڑے دھوئے اس کے بالوں میں تیل ڈال کر اس کے سر کی

اچھی طرح مالش کی۔ اور اپنے کنگھے سے سر کے بال سنوار دیئے۔ آج وہ بار بار بے

اختیار مسکرا رہی تھی ہنس رہی تھی۔ گنگنا رہی تھی ۔ اور اب جب چلتی تھی تو

فضا میں اس کا جسم ایک ابابیل کی طرح ڈولتا ہوا اور تیرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اسی طرح کام کرتے کرتے ایک ماہ اور گذر گیا۔ مگن اپنے بدن میں

ایک نئی پھرتی۔ چستی۔ اور طاقت محسوس کرنے لگا۔ اس کا سارا بدن سنولا

گیا تھا۔ باہوں کی مچھلیاں ابھر آئی تھیں اور پاؤں کے تلوے بجری کے پتھر ول

کی طرح سخت ہو چلے تھے۔ بلڈنگ بھی مکمل ہو چلی تھی۔ چند دنوں میں کام ختم

ہو جائیگا۔ پھر انہیں یہ بلڈنگ چھوڑ دینا پڑے گی۔

" پھر ہم کیا کریں گے ؟" مگن نے کسی قدر پریشان ہو کر تلسی سے

پوچھا۔

تلسی لاپرواہی سے بولی . . . . . " ادھر کسی دوسری بلڈنگ

پر جا کر نوکری ڈھونڈیں گے۔ بہت بلڈنگیں بن رہی ہیں "

اس کے لہجے میں ایسا گہرا اطمینان تھا کہ مگن کو یقین آ گیا ۔ وہ کروٹ بدل کر سو گیا ۔

ابھی اسے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ اس کے کان شور و غل کی آواز سے چونک گئے ۔ اور وہ آنکھیں کھول کر بیدار ہو گیا ۔

ایک آدمی تلسی کو دونوں ہاتھوں سے گھسیٹ کر پیٹنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ تلسی زور زور سے چلا رہی تھی ۔ اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی ۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہو رہی تھی ۔ ایک دم مگن لال گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور ان دونوں کے قریب جا کر بولا ..... " کیا ہے ؟"

" تمکو کیا ہے ؟" وہ آدمی غرا کر بولا " یہ میری گھر والی ہے اس کو لئے جا رہا ہوں "

" نہ تو میرا گھر والا ہے ، نہ میں تیری گھر والی ہوں ۔ میں تجھ کو چھوڑ چکی " تلسی غصے سے چیخ رہی تھی ۔ جب سے تو نے میری تائی کی جان لی میں تجھ کو چھوڑ چکی ۔ آج ڈیڑھ دو سال کے بعد تجھ کو اپنی گھر والی کی یاد آئی ؟ "

" جانے دے ، جانے دے" ! دوسرا آدمی جو تلسی کے گھر والے سے بھی لمبا تڑنگا تھا ۔ تلسی کو سمجھاتے ہوئے بولا ..... اسکو معاف کر دے گھر چل ! "

" نہیں میں اس کے سنگ کبھی نہیں جاؤں گی کبھی اس کے سنگ نہیں رہوں گی ۔ دارو پی پی کے اس نے مجھے بھوکا مار ڈالا ۔ میری ساری کمائی بھی چھین لی

تھا ۔ دارو پی جاتا تھا ۔"

" اب نہیں پیئے گا " دوسرا آدمی بولا ۔

" کیسے نہیں پیئے گا ؟ ابھی اسی ٹائم تم دونوں دارو پی کر آئے ہو !"

" چلتی ہے کہ مار کھائیگی " کھاکھرے نے تلسی کو لات مار کے کہا ۔

مگن لپک کر کھاکھرے کے سامنے آگیا ۔ غضب ناک لہجے میں بولا ۔

" اس کو چھوڑ دے !"

" کیوں چھوڑ دوں ؟ کیا تم اس کے یار ہو ؟"

مگن نے اس کے منہ پر ایک گھونسہ مارا کھاکھرے کے منہ سے خون نکلنے لگا ۔ مگن کو بڑی حیرت ہوئی ۔ اسے معلوم نہیں تھا ۔ اس کے گھونسے میں اتنی طاقت ہوگی ۔

کھاکھرے گالی بکتا ہوا مگن سے لپٹ گیا ۔ اڑنگی مار کر اس نے مگن کو نیچے گرالیا ۔ دونوں زمین پر اوپر تلے ہونے لگے ۔ بجری کے ڈھیر سے لڑھکتے ہوئے دور تک نیچے چلے گئے ۔ مگن غصے میں دونوں ہاتھ پاؤں چلا کر وار کر رہا تھا ۔ کچھ دیر کے بعد کھاکھرے ہانپنے لگا ۔ تو اس کا دوست کھاکھرے کی مدد کو پہونچا ۔ دونوں مل کر مگن کا مقابلہ کرنے لگے ۔ مگن بڑی جیداری سے لڑتا گیا ۔ مگر وہ دو تھے اور مگن اکیلا تھا ۔ مگن کا پلہ ہلکا پڑنے لگا ۔ دونوں ملکر اسے پیٹنے لگے ۔ تو تلسی میدان میں آگئی ۔ کبھی وہ ایک کو گھونسا مارتی کبھی دوسرے سے

گھولنسا کھاتی کبھی دانت کٹکٹاتی، کبھی پتھر اٹھا کے مارتی۔ مگر دوسرا آدمی بہت تگڑا تھا۔ اس نے تلسی کو بہت جلدی چپت کر دیا۔ اور وہ بے دم ہو کر کھاکھرے کے قریب گر پڑی۔ اب لڑائی مگن اور اس تگڑے آدمی کے بیچ ہو رہی تھی مگن ایک دیوانے کی طرح لڑ رہا تھا لگتا تھا جیسے وہ لڑتے لڑتے مر جائے گا۔ مگر ہار نہیں مانے گا۔

اپنے جسم کا آخری زور لگا کے اس نے اس تگڑے آدمی کو زمین پر پٹخ دیا۔ اور پھر قریب سے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر کھڑا ہو گیا۔

اب اٹھے تو اس پتھر سے تمہارا سر کچل دوں گا۔" مگن ہانپتے ہانپتے مگر شدید غصے کے عالم میں بولا۔

تگڑے آدمی نے مگن کے غضب ناک تیور دیکھ کر ہتھیار ڈال دیئے لیٹے لیٹے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر کے بولا۔

"سالا اس ٹائم دارو پیا ہے۔ بہت لڑ نہیں سکتا۔ صبح کا ٹائم ہوتا تو تم کو دکھاتا۔ اس ٹائم ہم کو معافی دو۔

اتنے میں بہت سے مزدور، مرد، عورتیں اور بچے بھی جمع ہو گئے تھے کھاکھرے اپنے دوست کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ مگن نے پتھر اپنے ہاتھوں سے نیچے زمین پر پھینک دیا۔

اس رات سفید مونچھوں والے بڈھے سے تلسی اور مگن

کو صلاح دی کہ وہ دونوں باہر نہ سوئیں۔ نہ بجری پر، بلکہ بلڈنگ
کے اندر گراؤنڈ فلور کے کسی کمرے میں جا کے سو جائیں کیا
معلوم یہ لوگ پھر بد معاشی کریں۔ اور دوسرے گنڈوں کو
لے کر آئیں۔

# سترھواں باب

ایک کمرے کے اندھیرے فرش پر دونوں لیٹے تھے۔ چپ چاپ۔۔ سمندر کی فاتحانہ گرج کو منگن اپنے دل کی۔ دھڑکن کی بازگشت معلوم ہوتی تھی۔

" منگنے!" تلسی بڑے کمزور لہجے میں بولی۔

" ہاں۔"

" تو میرے لئے کیوں لڑا!"

" ایسے ہی۔"

" بہت چوٹ کھائی ہے؟"

" نہیں تو۔"

" کہاں کہاں چوٹ لگی ہے۔ مجھے بتا دو!"

" کہہ جو رہا ہوں کہیں چوٹ نہیں لگی۔"

"میں پوچھتی ہوں مگنے۔ تم میرے لئے کیوں لڑے ؟"

مگن چپ رہا۔ دیر تک چپ رہا۔ یکایک اس نے محسوس کیا کہ تلسی کا ہاتھ اس کے جسم کو دھیرے دھیرے ٹٹول رہا ہے۔ ہوا کی سرگوشی سے بھی زیادہ کمزور آواز میں وہ بولی ....!

"کیا یہاں چوٹ لگی ہے؟ ..... کیا یہاں چوٹ لگی ہے؟"

تلسی کی نرم گرم انگلیاں مگن کے جسم کو چھونے لگیں۔

"ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟ ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟ مگن اپنے آپ سے پوچھنے لگا۔ میرا جسم کیوں گرم ہو رہا ہے؟ زمین سے بخارات اٹھ رہے ہیں سمندر کا شور اچانک بڑھ گیا ہے۔ دیواریں سانس لے رہی ہیں کسی مسرت آمیز خوشی میں کانپ رہی ہیں مگن کے اپنے ہاتھوں میں چنگاریاں سی اڑتی محسوس ہونے لگیں۔ رگوں میں خون لو دینے لگا۔ آنکھوں میں شعلے سے بھڑکنے لگے۔ اس نے بڑی تیزی سے تلسی کو اپنی دونوں باہوں سے گھسیٹ کر اپنے سینے پر گرا لیا۔

اور جذبات سے گلوگیر آواز میں آتشیں لہجے میں بولا۔

"آ تجھے بتاؤں۔ تجھے کہاں چوٹ لگی ہے!"

اب وہ اس بلڈنگ سے بہت دور شہر کے دوسرے حصے سے گذر رہے تھے کام کی تلاش میں . . . . مگن نے تلسی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور وہ دونوں خوش خوش نئے شادی شدہ جوڑے کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک بہت بڑی محل نما عمارت کو دیکھ کر تلسی ٹھٹک کر رک گئی حیرت سے دیکھنے لگی "کسی راجہ کا محل معلوم ہوتا ہے"۔

مگن اپنے گھر کی عالیشان عمارت کو دیکھ کر زور سے ہنسا۔ بولا۔

"اس محل میں سب نامرد رہتے ہیں"۔

پھر وہ تلسی کو گھسیٹ کر آگے لے گیا۔ محل پیچھے رہ گیا۔ نظروں سے دور ہو گیا۔

کئی دن تک انھیں کام نہ ملا۔ اور وہ شہر میں مارے مارے پھرتے رہے۔ ان کی ساری پونجی ختم ہو گئی۔ پھر جب انھیں تیسرے دن کا فاقہ تھا تو انہیں باندرہ بینڈ اسٹینڈ کے ناکے پر ایک چار منزلہ نامکمل عمارت میں کام مل گیا۔

عمارت کے سامنے سڑک تھی ۔ سڑک کے اس پار بینڈ اسٹینڈ تھا بینڈ اسٹینڈ میں ایک ایرانی ریستوران تھا ۔ ایرانی ریستوران کے پیچھے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا ۔

بلڈنگ میں لیٹے لیٹے تلسی نے کراہ کے کہا " مجھے سخت بھوک لگی ہے " ۔

مگن کچھ عرصے تک چپ رہا ۔ پھر جب تلسی نے ہلکی سی ایک سسکی لی، تو اس نے یکایک اپنی جیب کو تھپتھپایا " مجھے " محسوس کیا ۔ ۔ ۔ ۔ اٹھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تلسی کو بول کے چلا آیا ۔ ابھی آتا ہوں ۔

سمندر کے کنارے جاکر اس نے مجھے اپنی جیب سے نکالا ایک لمحے کیلئے اس نے " مجھے " دیکھا ۔ چاندی کے فریم کو دیکھا ۔ نامکمل بلڈنگ کی طرف مڑکے دیکھا ۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں خیال آیا ۔ اگر میں چاہوں تو ابھی اسی وقت اس نامکمل بلڈنگ کو خرید سکتا ہوں ۔ اسی ایک لوٹ سے ۔ ۔ ۔ ۔ !

مگر یہ خیال آتے ہی جیسے اس کے بدن میں جھرجھری سی آئی ۔ برف کے گالے گویا پھر اس کے خون کی لہروں میں گرنے لگے ۔ اس نے بڑی تیزی سے چاندی کا فریم اتار کر نیچے سمندر میں پھینک دیا ۔ اور مجھے لے جا کر ایرانی کی کاؤنٹر میں رکھدیا ۔ اور بولا ۔

" دو بڑے پاؤ دو ڈبل روٹی ) اور دو آملیٹ ۔ ۔ ۔ پاؤ اور آملیٹ

لیکر اور باقی خوردہ لیکر وہ واپس بلڈنگ کی طرف چل دیا۔

جس کے نچلے برآمدے میں ایک کالی عورت شیشے کے بُت کی طرح کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ آپ ہی آپ وہ خوشی سے ہنسنے لگا کیونکہ اس کے دس روپے کے نوٹ کو دس ——————— روپے کے نوٹ کی طرح دے کر اپنی غلامی کی آخری زنجیر توڑ دی تھی۔

≡

# اٹھارواں باب

کیفیاد ایرانی مشہد سے اپنی تیسری بیوی بیاہ کے لایا تھا۔ وہ بڑی خوب صورت اور نازک اندام لڑکی تھی۔ کیفیاد اسے بہت چاہتا تھا۔ مگر اس لڑکی میں ایک نقص تھا۔ رات کو کیفیاد ریسٹوران بند کر کے جاتا تو وہ سارے دن کی کمائی دھروا لیتی تھی۔

کچھ عرصے تک کیفیاد خوشی خوشی دیتا رہا پوری رقم پھر اسے کھلنے لگا۔ یہ کیا حرکت ہے۔ آخر دنیا ہیں اور بھی تو ضرورتیں ہیں۔ اور ان کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔

یہ سوچ کر وہ گول مال کرنے لگا۔ کیونکہ اسے اپنے تیسری بیوی سے بہت محبت تھی۔ اس لئے اب روز کی کمائی میں سے صرف پچاس فیصدی نکال کے لے جاتا۔ باقی رقم گلے میں رہنے دیتا۔ جسے وہ دوسرے دن بینک بھیج دیتا۔ مشہد کی حسینہ

نے چند روز تو کمائی کے کم ہو جانے پر اعتراض کیا۔ مگر جب ایرانی نے زمانے کی ہوشربا گرانی کا ذکر کیا تو وہ قائل ہو گئی۔ اسے یقین آگیا کہ اب بھی ایرانی اسے پوری کمائی لا کے دیتا ہے۔

آج بھی کیفنیا و رلیسٹوران بند کرتے وقت گلے سے دو سو روپے نکال کر چلا گیا۔ سوا دو سو کے قریب اس کے کاؤنٹر کی دراز میں رکھکر اسے تالا لگا دیا۔ اور رلیسٹوران کے باہر رکنے والی بس پکڑ کر گھر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد کوئی تین گھنٹے بعد دو چوروں نے سمندر کی طرف سے رلیسٹوران کی عقبی دیوار کا روشندان توڑ کر نقب لگائی۔ ۔ ۔ ۔ یہ مولو اور سولو تھے۔ دونوں چچازاد بھائی تھے۔ اور مل کر نقب لگاتے تھے۔ تجربے نے انھیں بتایا تھا کہ اس طرح نقب لگانے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے ایک کمند لگاتا ہے۔ دوسرا ادھر اُدھر دیکھتا رہتا ہے۔ اندر پہنچ کر مال اکٹھا کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ اگر عین موقع پر پکڑے جائیں تو مقابلہ کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ مولو اور سولو کا شمار شہر کے کامیاب ترین چوروں میں ہوتا تھا۔

رلیسٹوران کے اندر پہونچکر سب سے پہلے تو انہوں نے گلہ

توڑ کر اس میں سے سوا دو سو روپے اور کچھ نقدی سمیٹ لی
مگر اس اہم کام سے فارغ ہوئے تو سولو بولا ۔
" مجھے تو بھوک لگی ہے !"
" آئس کریم کھا لو "۔ مولو بولا ۔
" یہ آئس کریم والی بھوک نہیں ہے !"
سولو نے اتنا کہہ کر اِدھر اُدھر دیکھا ۔ ٹین کے ایک لمبے ڈبے پر بریٹینا لکھا تھا ۔ انہوں نے بکسا کھول کر اس میں سے بریٹینیا کی دو ڈبل روٹیاں نکالیں فریجڈیر کھول کر پولسن کا مکھن نکالا خوبانی کے جیم کا ایک ڈبہ کھولا ۔ اور ڈبل روٹی پر مکھن اور جیم لگا کے کھانے لگے ۔ مولو بولا ...... " مزہ نہیں آرہا ہے "۔
" تو چار انڈوں کا ایک آملیٹ بناؤ ۔ آدھا آدھا بانٹ کر کھا لیں گے ۔
سولو نے فریجڈیر سے چار انڈے نکالے ۔ کچن میں جا کے باقی سامان اِدھر اُدھر سے ڈھونڈ کے گیس پر چار انڈوں کا ایک لذیذ آملیٹ فرائی کیا ..... اب کچن میں آ گئے تھے ، تو چائے بھی بنا ڈالی ۔ اور پھر سارا سامان کچن سے باہر ایک میز پر رکھ کر اور کرسیوں پر بیٹھ کر شریف گاہکوں کی طرح کھانے لگے ۔

یکایک ایک الماری کے پیچھے سے کھٹر کا ہوا۔ مولو اور سولو دونوں دم بخود ہو گئے۔ چلتے ہوئے جبڑے رُک گئے۔ لقمہ حلق ہی میں رہ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے دونوں نے اپنی جیب سے چاقو نکال لئے۔

دوسرا کھٹر کا ہوا۔ کوئی ایک دم اچھل کر ان کے سامنے فرش پر آ رہا۔

"میاؤں؟"

ایک نہایت پیاری ایرانی بلی تھی۔ اپنی خوبصورت آنکھیں اوپر اٹھائے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بلی کو دیکھ کر مولو اور سولو کی جان میں جان آئی۔ دونوں کے چاقو بند کر کے جیب میں رکھے۔ توس کے ٹکڑے چائے میں بھگو بھگو کے کھانے لگے اور چوُرا بلی کو ڈالنے لگے۔ بلی نے سونگھ کر چھوڑ دیا۔ ایرانی بلی تھی۔ کوڑا کرکٹ نہیں کھاتی تھی۔

"میاؤں"

"اپنا حصہ مانگتی ہے"۔ مولو ہنسا۔

مولو نے ایک پلیٹ میں تھوڑا سا دودھ ڈال کر اسے فرش پر رکھ دیا۔

بلّی چپ چپ کر کے دودھ پینے لگی ۔ اور جب دودھ پی چکی تو لپک کر سولو کی گود میں آ رہی ۔ سولو پیار سے اس کی نرم نرم سمور پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

بولا " بڑی پیاری بلّی ہے۔ جی چاہتا ہے اِسے بھی جھولے میں ڈال کے لے چلوں ۔

" اٹھو اب !" مولو نے چائے ختم کرتے ہوئے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا ۔

" ٹھہرو !" سولو نے بلی کو آہستہ سے فرش پر چھوڑ کر کہا ...... بچوں کے لئے ایک ٹافی کا ڈبہ تو لے لوں ۔

سولو نے ٹافی کا ڈبہ لے کر جھولے میں ڈالا ۔

مولو نے برٹینیا بسکٹوں کا ڈبہ جھولے میں ڈالا ۔ بولا ۔

" اب چلو !"

" دونوں چلے "۔

" ٹھہرو ! سولو بولا ۔" کیسے عمدہ عمدہ سگریٹ یہاں رکھے ہیں "۔

مولو نے اسٹیفان کنگ کے سگریٹوں کا انتخاب کیا ۔۔ ایک ڈبہ جھولے میں ڈالا ۔

سولو نے نائن نائن نائن (۹۹۹) کے سگریٹ پسند کئے۔

"اب واقعی چلے چلو۔ زیادہ لالچ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔" مولو نے کہا۔

دونوں چلے۔

چلتے چلتے سولو کاسمٹک (ہارسنگھار) کی الماری کے سامنے رُک گیا۔

گھروالی کے لئے بھی تو کچھ لے کر چلنا چاہیئے۔

سولو نے اپنی گھروالی کے لیے ایک فرنچ عطر کی شیشی لی۔ مولو نے آدھی درجن لپ اسٹک جھولے میں رکھی۔ اور ایک یوڈی کلون کی شیشی۔

پھر سلور جارٹ کے دو پیکیٹ۔

"سالا ہندوستانی بلیڈ کسی کام کا نہیں ہوتا۔"

"نہیں اب تو بہتر بننے لگے ہیں۔" سولو بولا۔ دھیرے دھیرے ملک ترقی کرتا ہے۔ امریکہ کو دیکھو سو برس لگے ہیں۔ روس کو دیکھو پچاس برس لگے ہیں۔

سولو میٹرک فیل تھا۔ مولو کو صرف تین جماعت پڑھ کے

اسکول سے اُٹھ جانا پڑا تھا۔ اس لئے دونوں میں سولو دانشور مانا جاتا تھا۔ مولو کو سولو کی یہی باتیں کھلتی تھیں۔

"اچھا اب زیادہ قابلیت مت بگھارو۔ فوراً باہر نکل چلو!" وہ بولا "اگر کسی نے دیکھ لیا تو امریکہ روس دونوں بھول جاؤ گے، سیدھے جیل جاؤ گے"

سولو مولو کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اس دیوار کے قریب آ گیا۔ جس کے روشن دان سے رسّی ابھی تک بندھی ہوئی دیوار سے الگ الگ ہل رہی تھی۔ روشندان کی دیوار سے ملحق دیوار پر کیقباد ایرانی نے اپنے ملک کے بڑے بڑے آدمیوں کی تصویریں لگا رکھی تھیں۔ اور ان کی بغل میں بڑے بڑے قومی اور بین الاقوامی نیتاؤں کی تصویریں آویزاں تھیں۔

سولو نے ان کی طرف ایک نگاہ ڈال کے ٹھنڈی آہ بھر کر۔ اور بولا۔

"اگر میں چور نہ ہوتا تو اپنے ملک کا بہت بڑا نیتا ہوتا۔"

مولو کو سولو کی کمزوری معلوم تھی۔ سولو پالٹیکس پر گفتگو کرنا بہت پسند کرتا تھا۔ اُسے معلوم تھا۔ اگر اس وقت اُس نے سولو

کو کوئی جواب دیا تو بحث الجھ جائے گی ۔

اور صبح ہو جائے گی ۔ اس لئے وہ خاموش رہ کر اس کے سہارے دیوار سے باہر ٹکا کے اوپر چڑھنے لگا . . . . . . . . روشندان پر پاؤں ٹکا کے اُس نے سونو کو اوپر آنے کا اشارہ کیا ۔ سونو روشندان تک آیا ۔ اور ایک چالاک بلی کی طرح روشندان کے فریم کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دیوار سے پاؤں چپکا کر لٹک گیا ۔ رسی اوپر کھینچ کر مولو نے اُسے روشندان کے باہر پھینک دیا ۔ اور اس رسی کے سہارے باہر سمندر کے کنارے نکل آیا ۔ اور اس کے پیچھے پیچھے سونو بھی ۔ دونوں جلدی سے دیکھتے بھاگتے سمندری چٹانوں کی اوٹ میں ہو گئے ۔ اور ان کی اوٹ میں بھاگتے بستی سے ساحل کے قریب پہنچ گئے ۔

اب وہ نقب لگانے والی جگہ سے تقریباً ایک میل کی دوری پر تھے ۔ سونو نے گھڑی دیکھی تین بج رہے تھے

"چار بجے پولس کی پٹرول آئے گی ۔"

"بہت وقت ہے ۔"

"تو آؤ مال بانٹ لیں ۔ ؟"

دونوں نے اپنے حصے کے سگریٹ۔ بسکٹ۔ لپسٹک۔ سینٹ الگ کر لئے۔ پھر نقدی کی باری آئی۔ وہ بھی دونوں نے برابر بانٹ لی۔ پھر نوٹوں کی باری آئی۔ وہ بھی دونوں نے برابر بانٹ لئے۔ میں سولو کے حصے میں آیا۔ مولو چونکہ کم پڑھا لکھا تھا۔ اس لئے "مجھے" دیکھ کر جھنجھلا گیا۔ مجھے سولو کو واپس کرتے ہوئے بولا۔

"یہ نوٹ تم رکھ لو۔ مجھے کوئی دوسرا دیدو۔"

"کیوں دیدوں؟ کیا یہ دس کا نوٹ نہیں ہے۔؟"

"نوٹ تو ہے اسی لئے تو کہتا ہوں کوئی دوسرا دیدو۔"

"کیوں دے دوں؟ یہی تم کو لینا پڑے گا۔"

"لینا پڑے گا۔ کیا مطلب؟ یہ کہہ رہا ہوں یہ نوٹ بہت خستہ اور میلا ہے۔ اور تم بانٹ رہے ہو۔ آج۔ اور تم جان بوجھ کے یہ گندا نوٹ مجھے چپکانا چاہتے ہو۔"

جان بوجھ کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہارا مطلب ہے

یں تمہارے سنگ بے ایمانی کر رہا ہوں ؟"

"کھلی بے ایمانی ہے۔" سولو غصّے سے بولا۔ آج میں نے کمند لگائی تھی۔ حساب سے جو کمند لگاتا ہے۔ اس کو حصّہ جیادہ ملتا ہے۔ میں اس پر بھی چپ ہوں پر تم بے ایمانی کئے جا رہے ہو۔"

"زبان سنبھال کے بات کرو۔ پچھلی چوری پہ میں نے کمند لگائی تھی بھول گئے ؟"

"تو تم نے پانچ روپئے بھی تو جیادہ لئے تھے۔!؟"

"تو آج تم بھی لے لو۔ یہ پانچ روپئے اور بک بک بند کرو۔!"

"میں بک بک کرتا ہوں ؟"

سولو کے سارے جسم میں غصّے کی پھریریاں دوڑنے لگیں۔

"میں نہیں لیتا یہ پانچ روپئے مجھے یہ دس کا نوٹ بدل کے دو!"

"نہیں بدلہ جائے گا! . . . . .

سولو نے طیش میں آکے پوچھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے

چنگاریاں ناچنے لگیں۔

"ہاں ہاں نہیں بدلا جائے گا۔"

"مولتو نے چاقو نکال لیا۔

"پھر سولو نے بھی۔

پونے چھے کے قریب جب پولس کی گارد ساحل ساحل گشت کرتی ہوئی ڈانڈے پہنچی، تو انہیں چٹانوں کے عقب میں دو لاشیں ملیں۔ ریت پر کافی دور تک دھنگا مشتی کے نشان تھے اور لہو کی دھاریں ان کی جسموں سے نکل کر ریت میں جذب ہو کر خشک ہو چلیں تھیں۔ مولتو کا چاقو سولو کے دل میں گھس گیا تھا اور سولو نے مولتو کا حلق کاٹ ڈالا تھا۔

پولیس دونوں لاشیں اٹھوا کر تھانے لے گئی۔ اور دونوں جھولوں کا سامان اور روپیہ بھی انہوں نے اپنے قبضے میں کر لیا ............ کیقباد بہت خوش قسمت تھا۔ اُسے پوری رقم مل گئی اور چوری کا سامان بھی۔ ایک لپ اسٹک تک غائب نہ ہوا تھا۔

پولیس انسپکٹر سبطے حسن نے دونوں لاشوں کو فوراً شناخت کر لیا۔ کیونکہ مولو سولو دونوں کی تصویریں تھانے میں موجود تھیں۔ دونوں کئی بار سزا کاٹ چکے تھے۔

"ارے یہ تو سولو مولو ہیں۔" سب انسپکٹر کملے حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

"ہاں" سبطِ حسن انسپکٹر نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال کے نسوار کی ایک چٹکی دی ..........." دونوں کسی بات پر لڑ لئے ہوں گے"۔

"ہم ......... ہم ........." کملے نے حسرت سے لاشوں کو دیکھ کر پھر انسپکٹر کی جانب مڑ کر کہا۔۔۔

یہ دونوں تو چچازاد بھائی تھے !

سبطِ حسن نے کمال مشتاقی سے دونوں نتھنوں میں نسوار بھری اور بڑی بے زاری سے بولا :۔

ہمارے کا ہے کے بھائی ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کس کا باپ ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کون بیٹا ؟ ۔ ۔ ۔ آجکل جتنے رشتے ہیں کاغذ کے ہیں ۔

اتنا کہہ کر اس نے زور سے چھینک لی ۔

• • •

# انیسواں باب

لکھی نے رنگی سے کہا۔

"یہ دس روپئے بھی رکھ لے۔"

رنگی بولی۔

"کاہے کے لئے؟ پیسے تو تم دے چکے ہو۔"

اس کو ایڈوانس سمجھ لے۔ کبھی میری جیب میں پیسے نہیں ہوتے

ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ پر میں ایسا آدمی ہوں

جو کسی کا ادھار نہیں رکھتا۔ اس لئے ابھی سے

ایڈ والنس رکھ لے۔ پر یہ بھی یاد رکھ لے۔ میں کبھی بھی تجھ سے یہ روپئے مانگ سکتا ہوں۔"

"تو مانگ لینا۔ میں اسے اپنے سوٹ کیس میں سب سے نیچے کپڑوں میں رکھ دیتی ہوں۔ کبھی ہاتھ نہ لگاؤں گی تیرے نوٹ کو۔"

رنگی نے تجھے نیچے کپڑوں میں رکھ دیا۔ مکھی کے سامنے مکھی کو تسلی ہو گئی اور وہ چلا گیا۔ اور وہ کہہ گیا۔ میں پانچ دن کے بعد پھر آؤں گا۔

مکھی کے جانے کے بعد رنگی مسکرائی۔ جس بازار میں وہ رہتی تھی اور جیسا اُس کا دھندا تھا۔ اس میں اُسے ہر روز طرح طرح کے دھونکے بازوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ اور عجیب و غریب کردار اس کی نظر سے گذرتے تھے۔

ایک تھا جھویری۔ کالبا دیوی روڈ پر دلال تھا۔ شاید اُسے دنیا کی کوئی شے پسند ہی نہیں آتی تھی۔ دائیں کلے میں پان بھرے۔ بائیں کلے کو ذرا سا کھینچ کر زور سے پیک کی پچکاری مارتے ہوئے وہ دنیا کے ہر مسلے پر اپنی رائے

دینے کے لئے بے چین اور مصر نظر آتا تھا۔ اس کی گفتگو کی تمام علامتیں تشبیہیں اشارے۔ استعارے تلمیحات روپے سے متعلق ہوتی تھیں ........ یہ دس روپے ہیں آٹھ آنے ڈوب چکا ہے۔ چار آنے اس سال ڈوب جائے گا۔ چار آنے اگلے سال۔ وہ چھوکری اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے؟ بہت خوبصورت ہے؟! میرے خیال میں تو وہ روپے میں دو آنے بھی سندر نہیں ہوگی۔ میں تواں پانی پر تمہارے لئے کھولی ٹھیک کر رہا ہوں۔ روپے میں چودہ آنے سمجھ کام ہو گیا تیرا ...... آج دو روپئے کم ہیں۔ کل دے دوں گا تہ دوں تو روپئے کے سترہ آنے مجھ سے وصول کر لینا۔

ایک مانک لال تھا۔ کسی دفتر میں کلرک تھا۔ اور فرصت کے اوقات میں ...... انشورنس کا کام کرتا تھا۔ دنیا سرائے فانی ہے۔ یہ زندگی پانی کا بلبلہ ہے۔ یہ تمہارا جوبن جھوٹا سپنا ہے۔ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ آج آتا ہے کل جاتا ہے، آج چار آنے کم ہیں تو کیا اسی لئے مجھے دروازے سے لوٹا رہی ہو۔ اری پگلی یہ پیسہ یہ جوبن یہ غرور سب دھرا رہ جائے گا۔ جس دن لاد چلے گا۔ بنجارہ۔ کچھ ساتھ نہیں

جاتا ہے۔ صرف دو میٹھے بول ۰۰۰۰۰۰ اچھا باقی کل لا دوں گا۔ ویسے کل کیا پل کا بھروسہ نہیں ہے۔

پھر فیروزہ نام کا ایک ادیب تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رم کا پوا پاکٹ میں چھپا کے لاتا تھا۔ اپنے لمبے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے۔ بڑے کرب آمیز لہجے میں کہا کرتا۔ "کیوں آتا ہوں میں تمہارے پاس؟ مجھے خود معلوم نہیں میں ہر بار اپنے دل کو روکتا ہوں۔ سمجھاتا ہوں۔ پھر بھی چلا آتا ہوں۔ کیوں؟ کیا مجھے تم سے محبت ہے۔؟ نہیں! کیا میں تم پر ترس کھاتا ہوں۔؟ نہیں! نہیں ۰۰۰۰۰ کیا یہ سیکس ہے؟ نہیں! ۰۰۰۰۰۰ سیکس تو گلیوں میں کوڑیوں کے مول پڑا ملتا ہے ۰۰۰۰۰۰۰۰ پھر میں کیوں آتا ہوں تمہارے پاس؟ ۰۰۰۰۰۰؟ رنگی مجھے بتا دے۔ یہ سودا ہے خام کیا ہے؟ ۰۰۰۰۰۰۔ شاید میں اکیلا ہوں اس دنیا کے بھرے بازار میں بالکل اکیلا ہوں۔ کبھی کبھی یہ دنیا مجھے ایک سنسان جزیرہ معلوم ہوتی ہے۔ اور میں اپنی ذات میں بند ۰۰ ۰۰۰۰۰۰۰ بھکاریوں کی طرح تم سے رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔

یہ اذیت لب جام کیسی ہے؟ ...... تمہیں پا کر بھی میں کیوں نہیں تمہیں پاتا ہوں ...... وصل کے سنگم پر بیٹھ کر بھی خود کو اس قدر اکیلا کیوں محسوس کرتا ہوں۔ جیسے تم کو نہیں میں نے اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔ اے غم ذات اپنی گہرائیوں کو اور گہرا کر دے رنگی اس کمرے کی بتی بجھا دے۔ مجھے اس روشنی سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ جو مجھے تہذیب کی مکاری۔ انسان کی دھوکے بازی اور سیاست کی فتنہ پردازی کی یاد دلاتی ہے۔ رنگی اپنی اندھیری بانہیں میرے چاروں طرف پھیلا دے۔ کہیں سے مجھے ایک رم کا پوا پلا دے۔ آج تو میری جیب میں ایک چھدام بھی نہیں ہے۔

بڑے بڑے فراڈ آتے تھے۔ رنگی کے یہاں کبھی تو وہ ٹال جاتی کبھی چلا جاتی۔ ان کی شفاف پینترے بازی کو سمجھ کر انہیں باہر نکال دیتی مگر باہر نکال دینے کے فوراً بعد پچھتانے لگتی۔ عجیب دل پایا تھا۔ رنگی نے ....... اس نے اپنی آنکھوں میں کسی آنسو کو جگہ نہ دی تھی۔ کیونکہ اس کا پیشہ ہی ایسا تھا۔ مگر وہ آنسو جنہیں اس کی آنکھوں میں کوئی جگہ نہ ملی۔ اس کے دل کی نشیب میں آکر جمع ہو گئے تھے۔ اس کا دل جھوٹ کو جھوٹ سمجھ کر بھی اس کو باور کرنے پر تیار ہو

بھاتا تھا۔ اور وہ من ہی من میں پگھلنے لگتی تھی۔ کئی بار اُس نے اس ہمدردی کے کارن کی چرکے کھائے تھے۔ مگر رحمدلی اس کے مزاج کا خاصہ تھی۔ شائد وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ ہر چرکے کے بعد اپنے آپ کو سنبھالنے۔ اپنے مزاج کو بدلنے کی کوشش کرتی۔ چند دن یا چند ماہ کے لئے انتہائی سنگدل بن جاتی۔ پھر اپنی طبیعت سے مجبور ہو جاتی۔ پھر کوئی بڑا چرکا کھاتی ....... پھر توبہ کرتی ....

لکھی کو بھی اس نے ایک نئے ٹائپ کا فراڈ سمجھا۔ وہ مجھے کپڑوں میں رکھ کر بھول بھی گئی۔ پانچ دن بعد جب پھر لکھی آیا تو اسے میری یاد آئی۔ اُس نے یہی سمجھا آج لکھی اپنا ایڈوانس وصول کرے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ روپے میں چار آنے اُسے دھوکا دے۔ اور اس سے الٹا جاتے سمے دو چار روپئے اینٹھ کے لے جائے۔ وہ اپنے تحت شعور میں ہر طرح کی مدافعت کے لئے تیار ہو چکی تھی۔

مگر اب کے لکھی نے نئے ڈھنگ کا چرکا دیا۔ وہ پیسے لایا تھا۔ اُس نے ایڈوانس واپس نہیں مانگا تھا۔ نہ روپئے ادھار لئے تھے ۔

بس اتنا کہا - ! . . . . . . اب جب تک مجھے کام نہیں ملے گا - میں نہیں آؤں گا -

رنگی نے اسے بھی چند لمحوں کے لئے ایک چال سمجھا اس کی ہمدردی کو حاصل کرنے کے لئے ایک ترکیب اچھی. اس سے کہنا پڑا -

" کہاں کام کرتے تھے - ؟"

" دھوریا کے گراج میں موٹر مکینک تھا - کام چھوٹ گیا "

اس واقعے کے دو ماہ بعد تک وہ نہیں آیا - اور رنگی بھی اسے بھول گئی -

ایک دن دوپہر کو آن ٹپکا - وہ اس وقت سو رہی تھی وہ اسے جگا کر کہنے لگا -

" پکچر چلوگی ؟ "

" کام مل گیا !

" رنگی نے پوچھا -

" ہاں - "

" کہاں ؟

" ایک سائیکل مرمت کرنے والے کی دوکان پر کام مل گیا ہے "

"کون سی پکچر دیکھیں گے ؟"

"جو تم پسند کرو "

"جانِ بہار" دیکھوں گی "

"تو آؤ جلدی سے تیار ہو جاؤ ۔

وہ سب سمجھ گئی اب کیا ہونے والا ہے۔ اکثر گاہک پکچر دکھا کر سمجھ لیتے تھے کہ انہوں نے حاتم کی قبر پر لات مار دی ہے پکچر کے عوض مفت عشق کرنا چاہتے تھے ۔ اگر کوئی ان کی بات ٹال دے تو بے حد خفا ہوتے تھے۔ جو بے حد شریف ہوتے تھے وہ بعد میں سینما کے پیسے کاٹ لیتے تھے وہ پکچر دکھانے کی ترکیب سے بخوبی واقف تھی ۔۔ "مگر "جان بہار" اس نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی ۔۔ اور پکچر دیکھنے کا بے حد شوق تھا ۔ اس لئے وہ راضی ہو گئی ۔ تھوڑا سا لیس و پیش کیا ۔ پھر کپڑے بدل کر تیار ہو گئی ۔

مکھی نے اس کے میک اپ کو دیکھا ۔ اس کی رنگین بھڑکیلی ساڑی کو دیکھا برا سا منہ بنا کے بولا ۔

"اول ہوں یہ نہیں چلے گا۔"

"کیا نہیں چلے گا؟"

"رنگی نے کسی قدر غصے سے کہا۔

"یہ میک اپ دھو ڈالو۔ یہ ساڑی بھی بدل ڈالو۔ کوئی سفید ساڑی پہن لو۔ یہ کانوں میں لمبے لمبے جھالے بھی اتار دو... سادہ ... بالکل سادہ چاہیئے۔

اچھا تو یہ اسٹائل ہے بھی صاحب کا.......... رنگی دل ہی دل میں ہنسی کچھ لوگ طوائفوں کو گھریلو لڑکی بنا کے سینما لے جاتے ہیں۔ اس میں ان کو لذت ملتی ہے۔ معلوم ہو گیا لکھی صاحب کیا شے ہیں۔

وہ میک اپ دھو کر سفید ساڑی پہن کر۔ کان سے لمبے آویزے اتار کر اس کے ساتھ "جانِ بہار" دیکھنے چلی گئی۔ مگر یہاں پھر لکھی نے اُسے پھر چرکا دیا۔ سینما کے اندھیرے میں اس نے اس کا ہاتھ دبانے یا اس کا منہ چومنے کی کوشش نہیں کی۔ کمر میں ہاتھ تک نہیں ڈالا۔ ران نہیں مسلی۔ چٹکی تک نہیں لی۔ انتہائی شریف اور مہذب آدمی کی طرح اس کے ساتھ بیٹھا تصویر دیکھتا رہا۔

انٹرول پر وہ اُسے باہر لے گیا۔ اب وہ اس کے

نزدیک ایک سنجیدہ اطاعت شعار خاوند کی طرح اس کے قریب کھڑا تھا۔

"کیا پیو گی؟"

اس نے سوچا۔ جو کچھ میں پیوں گی۔ وہ بعد میں تو کٹ جانے والا ہے۔ اس کی رقم سے۔ اس لئے اس نے سر ہلا کے انکار کر دیا۔

"کچھ تو پینا ہی پڑے گا۔"

لکھی نے اصرار کیا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر ایک کوکو کولا لے آیا۔ گہری بھوری بوتل کے اندر ایک سفید رنگ کی ہلکی سی ڈنڈی بھی پڑی تھی۔ رنگی اس سفید ڈنڈی کے ذریعے کوکو کولا پینے لگی اتنے میں وہ بھنی ہوئی پاپ کارن کا ایک پیکیٹ لے آیا۔ نائیلان کا پیکٹ کھول کر وہ دونوں اس میں اپنی اپنی انگلیاں ڈال کر چکنے لگے۔ کبھی کبھی جب ان کی انگلیاں اس پیکٹ میں ایک ساتھ گڈ مڈ ہو جاتیں تو رنگی کو بہت اچھا لگتا تھا۔

سینما دکھانے کے بعد وہ اُسے اس کے بازار لے گیا۔ رنگی نے سوچا اب یہ مزدور میرے کمرے میں داخل ہو کر میرے پلنگ پھر دراز ہو جائے گا۔ مفت خور۔ . . . . مگر لکھی نے پھر

اسے چرکا دیا۔ وہ اس کے دروازے تک پہنچ کر رک گیا بولا۔

"اب میں جاتا ہوں"۔

رنگی کو دھکا سا لگا۔ بولی۔

"کیوں"

"ایسے ہی"

"اندر آؤ کچھ دیر تو بیٹھو"

رنگی نے مصنوعی مہمان نوازی سے کہا۔

"نہیں"

بولا اس کی آواز میں عجیب سا عجز اور شرمندگی تھی۔

"بس اتنے ہی پیسے کر پایا تھا۔ نیا نیا کام ملا ہے پھر آؤں گا۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

رنگی دیر تک دروازے سے لگی لگی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پہلے تو اس کا دل ہمدردی سے پگھلا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھالیا۔

"اونہہ یہ تو کوئی بہت بڑا فراڈ ہے"

وہ شام کا میک اپ کرنے اندر چلی گئی۔

ہولے ہولے وہ بکھی کو پسند کرنے لگی۔ اب بکھی تین سال سے برابر اس کے ہاں آ رہا تھا۔ مگر جس دن اس کی جیب میں پیسے ہوتے اسی دن اس بازار میں وہ ادھر ہی آتا تھا۔ کسی دوسری جگہ نہیں جاتا تھا۔ کبھی اس نے اس پر زیادہ حق نہیں جتایا۔ کبھی اس سے ادھار نہیں مانگا۔ کبھی اس کی رقم باقی نہیں رکھی۔ کبھی اس نے شادی کرنے یا گھر ڈالنے کی بات نہیں کی۔ کبھی شراب پی کے نہیں آیا۔ وہ صرف بیڑی پیتا تھا۔ اور کوئی نشہ نہیں کرتا تھا۔ اس نے آج تک رنگی سے کبھی کوئی رومانی بات نہیں کی تھی۔ کبھی شعر و شاعری کا چرچا نہیں کیا تھا۔ کبھی ٹھنڈی سانسیں نہیں بھری تھیں۔ انہیں باتوں سے رنگی بکھی کو پسند کرنے لگی تھی۔

بکھی بہت سے کام جانتا تھا۔ اس لئے کہیں زیادہ دیر تک ٹکتا

نہیں تھا۔ لڑ جھگڑ کے الگ ہو جاتا تھا۔ اور پھر جلد ہی کوئی دوسرا کام کر لیتا تھا۔ اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ ایک بڈھی اندھی ماں تھی۔ ماہم کی ریلوے لائین پار کر کے جیونت مل کے عقب میں گندے نالے کے قریب ایک کھلی نشیبی جگہ میں بہت سے جھونپڑے تھے۔ انہیں میں سے ایک جھونپڑے میں بکھی رہتا تھا۔

کبھی کبھی بکھی مہینوں نہیں آتا تھا۔ کبھی مہینے میں دو چار پھیرے کر جاتا ان تین سالوں میں رنگی کو معلوم تھا کہ بکھی کئی پیشے بدل چکا ہے۔ اس نے موٹر گراج میں مکینک کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ موٹر ڈرائیور رہا ہے۔ سائیکلوں کی مرمت کی دکان پر کام کرتا رہا ہے۔ اخبار بیچتا رہا ہے۔ فرنیچر بنانے والے کی دوکان پر کام کرتا رہا ہے۔ سینما کا گیٹ کیپر رہا ہے۔ ٹھیلے پر خربوزے اور آم بیچتا رہا ہے۔ بس کنڈیکٹر رہا ہے۔ پیڑول پمپ پر مستری رہا ہے۔ کھلونے والی ایک چھوٹی سی دوکان پہ گڑیاں بناتا رہا ہے۔ اُسے اپنے ہاتھوں پر بہت فخر تھا۔ وہ بہت کم بات کرتا تھا۔ مگر اس کی لمبی لمبی بے چین انگلیوں والے ہاتھ رنگی سے کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے۔

کچھ دنوں سے وہ الجھا الجھا سا رہنے لگا تھا۔ باتیں کرتا کرتا غائب ہو جاتا۔ باتیں تو وہ زیادہ کرتا بھی نہ تھا زیادہ تر رنگی کی باتیں سنتا رہتا۔ جو اس کے آتے ہی اس سے پٹر پٹر باتیں شروع کر دیتی تھی۔ بازار کے قصے اس کی دوسری سہیلیوں کے سیکنڈل ضروریات زندگی گرانی۔ فلمی رسالوں کی افواہیں۔ تازہ پڑھے ہوئے کسی جاسوسی ناول کا پاٹ۔ چار دن پرانے اخبار کی پڑھی خبریں وہ اس کی غیر حاضری میں سب کچھ سینت سینت کے رکھتی جاتی اور اس کے آتے ہی بڑی بوڑھیوں کی طرح چلّو ہو جاتی۔ اور جب تک ہفتے دس دن کا پشتارہ کھول کر اس کے حوالے نہ کر دیتی اسے چین نہیں آتا۔ سب سنا کے وہ ایک اطمینان کی سانس لے کر کہتی۔

"اب تم سناؤ۔"

اور وہ جواب میں کہتا۔

"کیا سناؤں سب ٹھیک ہے۔"

آج رنگی نے طے کر لیا اس سے پوچھ کے رہے گی۔

"تین چار دن سے کہاں ہو؟"

"تمہارے پاس ہی بیٹھا ہوں۔"

"بیٹھے تو ہو مگر غائب ہو۔"

وہ آہستہ سے مسکرا کر چپ رہا۔

چپ چاپ رتنی اس کے غمزدہ چہرے کو دیکھتی رہی۔

بہت دیر تک وہ اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ آخر سر اٹھا کے بولا۔

رتنی میرا گھر دیکھو گی۔

کیوں ...؟

ایسے ہی ...

رات کے گیارہ بجے تھے جب وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔ ماہم اور گنگ سرکل کے بیچ کی ریل پٹری پار کر کے۔ ایک نشیبی گندے نالے کے پل کو پار کر کے وہ جیونت مل کے پچھواڑے کی جھونپڑیوں میں پہنچے اکثر جھونپڑیوں میں اندھیرا تھا۔ اس کے جھونپڑے میں ابھی تک ایک

لالٹین جل رہی تھی ۔

اُس نے آہستہ سے دروازہ کھولا ۔ حالانکہ دروازہ اندر سے بند تھا ۔ مگر زنجیر اتنی ڈھیلی تھی کہ وہ دو انگلیاں اندر ڈال کے زنجیر کو آہستہ سے سرکا کے دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو جاتا تھا ۔ اندر اندر تھا بھی کیا جو چور لے جاتا ۔ ایک کونے میں ایک جھنگے پہ اس کی بوڑھی ماں سو رہی تھی ۔ اُس کے پہلو میں اس کی چھوٹی آٹھ سالہ بہن منہ کھولے دھیرے دھیرے خراٹے لے رہی تھی ۔ ایک کونے میں چولھا تھا ۔ اور چند برتن تھے ۔ ایک کونے میں لکڑی کا ایک بکسا اور بکسے کے اوپر چند میلے کپڑے ۔ اور توشک اور اس کے اوپر ایک الگنی جس پر میلے میلے کپڑے جھول رہے تھے ۔

جھونپڑے کا دروازہ آہستہ سے اور بے آہٹ کھولتے ہی مکھی نے رنگی کی طرف دیکھ کر اپنے منہ پر انگلی رکھ لی تھی ۔ وہ اس وقت دروازے پر کھڑی کھڑی جم گئی تھی ۔ جھونپڑے کے اندر ہر طرف گھور گھور کے دیکھ رہی تھی ۔

چند لمحوں کے بعد لکھی نے اپنے جھونپڑے کا دروازہ آہستہ سے بند کیا ۔ اور خاموشی سے رنگی کو واپس جانے کو کہا ۔ اور وہ اسی طرح چپ چاپ واپس ہو لی ۔

جھونپڑوں سے نکل کر وہ گندے نالے کے پل پر آ گئے ۔ پل پر چلتے چلتے لکھی نے جیونت ٹیکسٹائل مل کی اونچی لمبی چمنی کی طرف دیکھ کر کہا " میں نے اب مل میں نوکری کر لی ہے ۔ اور یہ نوکری اب میں کبھی نہیں چھوڑوں گا ۔ جی جان سے کام کروں گا ۔" رات کے اندھیرے میں رنگی کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں ۔ لکھی انھیں دیکھتے ہوئے عجوب سے لہجے میں بولا " اب ہولے ہولے حالت ٹھیک ہو جائے گی رنگی !"

رنگی پھر بھی کچھ نہیں بولی ۔

پل پار کر کے وہ تھوڑی سی اونچائی چڑھ کر ریلوے لائن پر آ گئے ۔ رنگی سر جھکائے چل رہی تھی ۔ یکا یک لکھی نے رنگی کو ہاتھ سے پکڑ کر پیچھے گھسیٹ کر کھڑا کر دیا ۔ ایک فاسٹ لوکل زور سے کوکتی ہوئی کھٹکھٹاتی ان کے قریب سے گذر گئی ۔

اُس اچانک شور میں لکھی نے زور سے چلا کر
کہا ۔
" رنگی مجھ سے شادی کرو گی ؟"
چلتی ہوئی فاسٹ لوکل کا طوفانی شور ۔ پہیے
مہیب آوازیں کھٹکھٹاتے ہوئے ۔ ان آوازوں
کی ہیبت ناک گونج میں ایک تنکے کی طرح لکھی
کی آرزو بھنور میں چکر کھاتی ہوئی ۔
پھر شور ختم گیا ۔ گاڑی چلی گئی ۔
یکایک سناٹا بہت بڑھ گیا ۔ رنگی نے
کوئی جواب نہیں دیا ۔ وہ ریل کی پٹری پار کرنے
لگی ۔ ریل کی پٹریاں پار کر کے وہ دوسری
طرف چلے گئے ۔ یہاں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی ایک
خالی نشیبی زمین سے گذر کر اسٹیشن جانے والی سڑک
سے مل جاتی تھی ۔
رنگی نے وہ چھوٹی سی پگڈنڈی بھی پار کرلی ۔
اب وہ سڑک پر آگئی ۔ پھر بھی وہ کچھ نہیں بولی ۔
لکھی ایک مجرم کی طرح سر جھکائے اس کے ساتھ

ساتھ چلتا رہا ماہم کا اسٹیشن قریب آرہا تھا۔

رنگی چلتے چلتے ایک سنکیر کے پیڑ کے نیچے

رُک گئی۔ ہانپتے ہانپتے وہ لکھی کے کلیجے سے لگ

گئی بولی۔

" ہاں کروں گی ما"

" پر تم جھوٹ تو نہیں بولتے ہو"

اتنی بار یہ جھوٹ مجھ سے بولا گیا ہے لکھی کہ

اب میں ........ میں .....۔ اگر تم بھی

اسے سہار نہ سکوں گی۔

لکھی سچ کہہ دو میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی

میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں تم سے کیا کہوں گی....

پر لکھی اتنا بڑا جھوٹ مجھ سے مت بولو۔ کہہ دو یہ

جھوٹ ہے ........ جھوٹ ہے نا .....

جو تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟

رنگی ہولے ہولے بھکنے لگی۔

وہ آج تک کبھی لکھی یا کسی گاہک کے سامنے

نہیں روئی تھی۔ پر اب آنسو ختم ہی نہیں ہوتے تھے

لکھی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے اپنے سینے سے لگائے۔ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اسے چپٹائے رہا وہ دونوں شاید ایسی خوشی سے لرز رہے تھے۔ جو دنیا میں ہر کسی پر صرف ایک بار آتی ہے۔ یکا یک رنگی اور لکھی کو احساس ہوا کہ وہ دور اوپر سن کیسر کی ڈالیوں پر کھلے ہوئے پھول ان کے قریب آ گئے ہیں۔ وہ اسی سن کیسر کے تنے سے ٹیک لگائے رات کی اوس میں بھیگی گھاس پر بیٹھ کر اپنی آئیندہ زندگی کا نقشہ بنانے لگے۔ رنگی کے لئے ایک دلہن کا جوڑا۔ ایک سادہ جوڑا۔ چوڑیاں۔ سیندور کی ڈبیہ، کھانے کے لئے چند برتن۔ لکھی کے لئے ایک نیا جوڑہ وغیرہ وغیرہ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

حساب کر کے لکھی نے بتایا۔ کچھ روپیہ میں قرض لے لوں گا۔ باقی تنخواہ میں کام چل جائے گا۔ آج تین تاریخ ہے۔ پانچ کو پگار ملے گی۔ پگار وصول کر کے میں پونا جاؤں گا۔ وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے اس سے باقی روپے قرض لے لوں گا

واپس آتے ہی تمہیں سے لے چلوں گا۔ جھونپڑوں میں شادی ہو گی۔

"ماں سے کیا کہو گے ؟"

وہ بے چاری اندھی ہیں۔ انہیں زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے اتنا میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں نے اپنی پسند کی ایک شریف لڑکی ڈھونڈ لی ہے ۔"

رنگی سر جھکائے دیر تک چپ رہی ۔

آخر لکھی نے کہا ۔

پانچ کی شام یا چھے کی صبح میں پونا جاؤں گا ۔ وہاں سے سات کو لوٹوں گا یا آٹھ کو اب میں تمہارے پاس سات کی رات کو یا آٹھ کی صبح کو یا نو کو کسی وقت آؤں گا اور سب تیاری کر کے آؤں گا ۔ تمہیں یہاں سے لے چلوں گا ۔"

" رنگی پھر بھی کچھ نہیں بولی ۔

لکھی نے اٹھتے ہوئے کہا " اب چلو ۔"

# بیسواں باب

وعدے تو بہت سے لوگوں نے کئے تھے۔ تقریباً ہر گاہک شراب کی مستی میں اس کی نوجوانی اور دلی شرافت پر ترس کھاکر اسے گھر میں ڈال لینے یا شادی کر لینے کا وعدہ کیا کرتا تھا۔ اور پھر بھول جاتا تھا۔ یہ تو روز مرہ کی بات تھی۔ اور رنگی ان وعدوں

کی حقیقت سے بخوبی واقف تھی ۔ ان باتوں پر اب وہ مطلق بھروسہ نہیں کیا کرتی تھی ۔
لیکن جانے کیوں اسے لکھی کی باتوں پر اعتبار آگیا تھا ۔ اس کے دل نے گواہی دی تھی ۔ نہ صرف اس نے خود یقین کر لیا تھا ۔ بلکہ اس نے اپنی تین ہمراز سہیلیوں ۔ بالو لطیفہ اور دلاری کو بھی بتا دیا تھا ۔ ان تینوں سہیلیوں نے اسے گلے لگا لیا تھا ۔ دلاری تو روئی بھی تھی ۔ اور انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کو قسم کھائی تھی ۔

" کہ وہ بازار میں کسی پر یہ راز افشا نہیں کریں گی " ۔

چھے تاریخ گذر گئی ۔۔ سات تاریخ گذر گئی ۔ آٹھ تاریخ گذر گئی ۔۔۔ رنگی دن رات ، دوپہر لکھی کا انتظار کیا کرتی ، تین دن سے اس نے لال میک اپ نہیں کیا تھا ۔۔۔ ہر گاہک کو دروازے سے لوٹا دیا تھا ۔

تین دن سے وہ سیدھی مانگ نکالے ۔۔ سفید ساڑی پہنے اپنے پلنگ پر لیٹی کوئی فلمی رسالہ پڑھتی رہتی ۔ کان دروازے پر کسی کی آہٹ کے منتظر رہتے اکثر و بیشتر دروازہ کھول کر چھ گھنٹ پر کھڑی ہو جاتی اور لکھی کا انتظار کرتی ۔ لکھی جس نے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا ۔ اس سیاہ جہنم سے نکلنے کا راستہ دکھایا تھا ۔ لیکن جب آٹھ تاریخ بھی گذر گئی اور نو تاریخ کی صبح بھی گذر گئی تو رنگی کا دل ڈوبنے

لگا۔ لکھی بھی جھوٹا نکلا۔ دوسروں کی ہی طرح نکلا۔ مطلبی۔ دھوکے باز۔ ظالم۔ مگر آخر اسے ایسا لمبا جھانسہ دینے کی کیا ضرورت تھی اس نے تو کبھی لکھی سے کچھ زیادہ نہیں مانگا تھا۔ کسی جھوٹ کی کسی دلفریب دھوکے کی خواہش نہیں کی تھی۔ پھر لکھی نے ایسا کیوں کیا۔

گذشتہ تین دنوں سے اس کی تینوں ہمراز سہیلیاں بار بار اس کے پاس آتی تھیں اور ہمدردی کے لہجے میں پوچھتی تھیں۔

" لکھی نہیں آیا"۔

" نہیں آیا کیا"؟

مگر چوتھے روز کی دوپہر بھی گذر گئی۔ تو ان کا ہمدردانہ رویہ تضحیک میں بدل گیا۔ بڑی احمق ہے تو جو ان مردوں پر اعتبار کر بیٹھی۔

ارے یہ سب مرد ایک سی کے ہوتے ہیں"۔

" شادی کرے گا ایک بازاری عورت سے . . . . اونہہ"۔

" تجھ سے!" لطیفہ ہنس پڑی " اسے کیا پڑی ہے۔ ایسا گدھا ہے وہ کیا۔

بانو۔ لطیفہ۔ دلاوری تینوں زور سے ہنس رہی تھیں۔

رنگی کی آنکھوں میں آنسو آ چلے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے جذبات پر قابو پایا۔ اور ان تینوں کو باہر نکال کے اندر سے دروازہ

بند کر لیا ۔ پھر پلنگ پہ اوندھی پڑ کے سسکنے لگی ۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی ۔ جانی پہچانی دستک رنگی کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا ۔ پلنگ سے بھاگی بھاگی دروازے کی طرف گئی ۔ جلدی سے دروازے کے دونوں پٹ اچھی طرح سے کھول دیئے ۔

باہر جیون کھڑا تھا ۔ مارے خوشی کے اس کی کھیسیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں ۔

" ایک گاہک بیس روپئے دیتا ہے ۔ لے آؤں ؟ "

رنگی ایکدم غصے سے بھڑک گئی ۔ کہہ جو دیا مجھے کوئی گاہک واک نہیں چاہیئے دفع ہو جاؤ ۔ "

جیون بڑی سنجیدگی سے اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا ۔

" ارے کس کا انتظار کرتی ہو رنگی ۔۔ ہم سے لکھوا لو وہ نہیں آئے گا ۔ نہیں آئے گا ۔ چاہے تو اسٹامپ پر لکھوا لو ۔

رنگی دھک سے رہ گئی ۔

تو اس کا مطلب ہے یہ خبر بازار میں بھی پہنچ گئی ہے ۔ اس کی سہیلیوں نے سب کو بتا دیا تھا ۔

غم اور غصے سے کانپتے ہوئے اس نے پھر اندر سے دروازہ بند کر لیا ۔

نہ جانے کب تک وہ اپنے پلنگ پر لیٹے سسکتی

سی بڑی رہی ۔ لگتا تھا آج اس کا دم نکل جائے گا ۔

کچھ عرصہ بعد اسے باہر بازار میں ایک شور سا سنائی دیا ۔ بہت سے آدمیوں کے ایک ساتھ باتیں کرنے کا بڑھتا ہوا شور ـــ اور اس شور پر شام کا اخبار بیچنے والے کی صدا ۔

" ماٹنگا کے قریب دو گاڑیوں کا حادثہ ـــ ساٹھ آدمی مر گئے ۔ دو سو آدمی زخمی ـــ پچھلے سو برس کا سب سے بڑا حادثہ ـــ "

رنگی ننگے پیر اپنے گھر کو کھلا چھوڑ کر دوڑتی ہوئی بازار میں چلی گئی اور اخبار والے سے ایک اخبار چھین کر اسے پڑھنے لگی ۔

وہ ماٹنگا گئی اس جگہ جہاں حادثہ ہوا تھا ۔ اور جہاں سے ابھی تک لاشیں اور زخمی لوگ اٹھا کر لے جائے جا رہے تھے ۔ وہ ایک ایک ڈبے کو چھانتی پھری ۔ ہر اسٹریچر کو اس نے غور سے دیکھا ۔ اس کا لکھی ان میں نہیں تھا ۔ پھر وہ ہسپتالوں میں اس کو ڈھونڈتی پھری ۔ لیکن وہاں بھی لکھی نام کا کوئی زخمی نہیں تھا ۔

رات کو وہ مورگ میں پہنچ گئی ۔

قطار اندر قطار لاشیں رکھی تھیں ۔ اور دیکھنے والے

کبھو لگا کر اپنے پیاروں کو ڈھونڈنے آرہے تھے ۔ جھک جھک کر پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے ۔ مرنے والوں کی آنکھیں کھلی تھیں ۔ مگر وہ پہچان نہیں سکتے تھے ۔ وہ آواز بھی نہیں دے سکتے تھے ـــــ کسی کی تلاش میں ہو ۔ ادھر آؤ ـــــ دیکھو میں یہاں لیٹا ہوں ۔ ماں میں تمہارا بچہ ہوں ۔ مجھے گلے سے لگالو ۔

ایک لاش کو دیکھ کر رنگی ٹھٹکی ۔ جھُکی ۔ پھر اس لاش سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔

مورگ کا ایک آدمی اس کے سر پر آکے کھڑا ہو گیا ۔

" کیا تم اس لاش کو پہچانتی ہو ؟ "

" ہاں "۔

" کیا تم اس کی بیوی ہو "۔

نہیں ـــــ

اس کی بہن ـــــ

نہیں ـــــ

پھر کون ہو ـــــ

" میں تو کوئی بھی نہیں ہوں ۔ کوئی بھی نہیں ہوں ۔ اس کی ـــــ

رنگی کی چیخیں نکل گئیں ـــ وہ لاش سے لپٹ کر رو رہی تھی ۔

مورگ کا آدمی چلا گیا ۔ جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پیکیٹ تھا ۔ پیکیٹ میں سے ایک سرخ رنگ کی ساڑی جھانک رہی تھی ـــ دلہن کی ساڑی ـــ وہ آدمی بڑے ٹھنڈے لہجے میں بولا ۔

" ایک پیکیٹ اور بھی ہے ـــ کچھ رقم بھی ہے تم اگر اس کے گھر والوں کا پتہ ہمیں دیدو تو ہم انھیں اطلاع کر دیں گے ۔

رنگی اپنے آنسو پونچھ کر پتہ لکھوانے لگی ۔

رات کو اس کے بازار میں بڑی گہما گہمی تھی ۔ بجلی کے قمقمے شرابیوں کے چہچے ۔ پائل کی کھنک ، گیت کی سرگم ـــ جلمی پیا کیت دیس گیو ـــ جلمی پیا ۔

رات بھر وہ اپنے کمرے میں روشنی کے بغیر اپنی

خشک آنکھوں سے اندھیرے میں ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔
اس کی سہیلیاں اس سے ہمدردی کرنے کے لئے آئیں ۔ مگر اس
نے کسی کو اپنے کمرے میں نہیں آنے دیا۔ رات بھر وہ اپنے
پلنگ پر بیٹھی ۔ ٹانگیں نیچے لٹکائے ۔ اندھیرے میں دیکھتی رہی
اور کچھ سوچتی رہی ۔

صبح چار بجے کے قریب جب ابھی کافی اندھیرا تھا ۔
جب رونق چھٹ گئی تھی ۔ اور بازار کے شور کو بھی اونگھ سی آگئی تھی۔
وہ اپنے سے اٹھی ۔ اس نے اپنے سوٹ کیس میں چند کپڑے
ڈالے ۔ باقی سارے سازوسامان کو ۔ کمرے کو کھلا چھوڑ کے
تیز تیز قدموں سے بازار سے باہر نکل گئی ۔

جب صبح سویرے جب ہلکی ہلکی پو پھوٹ رہی تھی ۔
اس نے لکھی کے جھونپڑے پر جاکر دستک دی ۔ اندر سے کسی
نے کراہ کے پوچھا ۔

" کون ہے!"

" میں ہوں دروازہ کھولو"۔

لکھی کی آٹھ سالہ بہن نے دروازہ کھولا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اندھی ماں بستر پر نڈھال بیٹھی تھی۔

رنگی سیدھی اندر چلی گئی۔ اس نے لکھی کی چھوٹی بہن کی حیرت زدہ نگاہوں کی پرواہ نہیں کی۔ وہ سیدھی لکھی کی ماں کی کھاٹ کے قریب چلی گئی۔ اپنا سوٹ کیس زمین پر رکھ کر اس نے لکھی کی ماں کے پیر چھوئے۔

" تم کون ہو!" ماں حیرت زدہ اور کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

رنگی نے کہا " میں لکھی کی بیوی ہوں۔ چند مہینے ہوئے اس نے مجھ سے خفیہ بیاہ کر لیا تھا۔ مگر آپکو نہیں بتایا تھا"

لکھی کی ماں رو کر بولی " ہائے لکھو نے مجھے بتایا تو تھا ۔۔۔ کہ اس نے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے"

میری شادی ہو چکی ہے۔ لکھی سے" رنگی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا " اور اب میں گھر میں آ گئی ہوں۔ آج سے میں یہیں رہوں گی اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھی پالوں گی اور اپنی ساس نند کا بھی ۔۔۔ اپنی بہو کی آشرکی داد دو ماں ۔

لکھی کی ماں کچھ دیر چپ رہی۔ اپنی اندھی آنکھوں سے جیسے خلا میں کچھ ڈھونڈ رہی ہو۔ اپنی پھر کانپتے ہاتھوں سے رنگی کے چہرے کو ٹٹولنے لگی۔۔۔ ہونٹ، ناک، کان، گال، ... گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں سے وہ لرزتی بوڑھی انگلیاں بھیگ گئیں۔ ماں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر رنگی کو اپنے کلیجے سے لگا لیا۔ رنگی نے دوسرے ہاتھ سے روتی ہوئی بہن کو لپٹا لیا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا "ماں میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" وہ جھونپڑے کے دوسرے کونے میں چلی گئی۔ لکھی کی چھوٹی بہن خالی ہاتھ لٹکائے اس کے پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی۔ رنگی نے چولہا ٹھیک کیا برتن قرینے سے لگائے۔ چائے کی پتی کو ڈھونڈا۔ چائے کی پتی نہیں تھی۔ شکر نہیں تھی۔ دودھ نہیں تھا۔ گھر میں کچھ نہیں تھا۔

حیران ہو کر اس نے لکھی کی بہن کی طرف دیکھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا چہرہ جھکا لیا مگر میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ رنگی نے سوچا۔۔۔ اور ماں سے مانگنا اسے اچھا نہیں لگا۔ پھر وہ کیا کرے۔

یکایک اسے یاد آیا۔ لکھی نے ایک بار دس روپے کا نوٹ اسے ایڈوانس میں دیا تھا۔ اور دس کا نوٹ اس کے سوٹ کیس میں کپڑوں کے نیچے پڑا تھا۔

جلدی سے سوٹ کیس کھول کر رنگی نے "تجھے" نکالا۔ چولی میں ڈال کر لکھی کی بہن سے بولی۔

"میں ابھی آتی ہوں"۔

وہ دروازہ آہستہ سے بند کر کے باہر نکل گئی۔ جھونپڑ محول سے نکل کر وہ گندے نالے کے پل پر پہنچی۔ اسے لکھی کے قدم یاد آئے اور گندی زخمی زندگی کی لباس کے نتھنوں میں آنے لگی۔ وہ جلدی جلدی پل پار کر کے ریل کی لائن کراس کرنے لگی۔

ریل کی پٹڑی پار کر کے وہ سڑک پر چلتی گئی۔ سن کیسر کے پیڑ کے قریب جا کے خود بخود اس کے قدم رک گئے۔ اس کے تنے سے لگ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی لمحے اسے ایسا لگا۔ بس ایک لمحے کے لئے اسے ایسا لگا۔ جیسے وہ دلہن کا لال جوڑا پہنے سن کیسر کے پھولوں سے مہکتی کھڑی ہے۔ لکھی اس کے پاس آگیا ہے اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سرگوشی کی سی میٹھی میٹھی آواز میں اس سے محبت کی باتیں کر رہا ہے۔

"کائیں۔ کائیں"۔

ایک کوا سن کیسر کی ڈال سے چلا پڑا۔ گھبرا کر رنگی نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ لمحہ چلا گیا تھا۔ دنیا اپنی جگہ پر واپس آگئی تھی۔ سن کیسر

کے پھول بہت دور اوپر چلے گئے تھے۔ سب کچھ اسی طرح تھا۔ بھیانک ڈراؤنا مشکل سخت دل ——— مگر وہ بدل گئی تھی۔

اس نے اپنے ساڑی کے پلّو کو کس کر اپنی کمر کے گرد باندھا زبان نکال کر کوّے کا منہ چڑھا دیا۔ اور دس کا نوٹ ہاتھ میں لے کر بنیئے کی دوکان سے سودا خریدنے چلی گئی۔




کبھی کبھی میں سوچتا ہوں ان لوگوں کے بارے میں جن کے ہاتھ سے میرا لین دین ہوتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ جب وہ مجھے دیتے ہیں کسی دوسرے کو تو کیا دیتے ہیں اور جب لیتے ہیں تو کیا لیتے ہیں ؟۔ خوشی کا ایک وعدہ محبت کا کوئی دھوکہ کر مجبور محنت کا ایک لمحہ ۔ ہر آن میں تاش کے پتے کی طرح زندگی کے جوا خانے میں پھینکا جاتا ہے ایک آوارہ کتے کی طرح ۔ سماج کی سڑک پر سینکڑوں بکھری ہوئی زندگیوں کے کوڑے کرکٹ کو سونگھتا ہوا چلا جاتا ہوں ۔ فائدے اور نقصان کے کونٹر پر لاکھوں خواہشوں کا بھگتان کرتا ہوں ایک دم دار ستارے کی طرح مختلف طبقاتی تہوں کو چیرتا ہوا گذر جاتا ہوں ۔ اور جدھر جدھر سے گذرتا ہوں میرے لمس سے رشتے اور انکی پر پیچ تاریک کڑیاں روشن اور واضح ہوتی جاتی ہیں ۔

بہت عجیب ہیں وہ لوگ ۔ پہلے تو خود ہی میری تخلیق کرتے ہیں پھر ہاتھ جوڑ کر مجھے پوجنے لگتے ہیں ۔ اور خدا مان لیتے ہیں ۔ اور خدا کی طرح اپنی ہر خواہش کی تکمیل مجھ سے چاہتے ہیں ۔ وہ اپنی زندگی کا پورا بوجھ مجھ پر ڈال دیتے ہیں ۔ اور بھول جاتے ہیں کہ میں تو کاغذ کی ایک ناؤ ہوں جو زندگی کی لہروں سے کھیل تو سکتی ہے کسی کو پار نہیں لگا سکتی ۔ انہیں خواہشوں کی اندھی تلاش میں انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا ہے ۔ اور بھول گئے ہیں کہ میں نہ تو انسان کی محنت ہوں نہ محبوب کی محبت نہ علم کا موتی میں تو ایک کاغذی پیرہن ہوں جس کا مدعائے تحریر عنقا ہے اسپر بھی وہ مجھے تجوریوں میں بند کرتی ہیں ۔ بینکوں میں رکھتے ہیں ۔ خفیہ تالوں میں محفوظ کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ میرے ذریعے سب کچھ خرید سکتے ہیں ۔ حالانکہ جب کبھی میں نے اپنے آپ کو کسی مغرور انسان ، اپنی محنت کے نشے میں سرشار انسان کے مدمقابل پایا ہے اپنے آپ کو اپنی جبروتی طاقت کے باوجود ایک کاغذی پرزے کی طرح حقیر اور بے بضاعت پایا ہے ۔ مگر ایسے لمحے میری زندگی میں کم آئے ہیں ۔

شاید میں اسی لئے اپنے بارے میں اس قدر سوچتا ہوں ۔ شاید ایک کرنسی کے نوٹ کو بھی اپنی زندگی کے معنی دریافت کرنے کا حق ہے ۔ کیا ہوں میں ؟ کاغذ کا ایک پرزہ ۔ سرکار کا حکم نامہ ۔ قیمت کا پیمانہ کہ انسان کی خواہشات کا

آئینہ ؟"

میں راحت بھی اور مسرت بھی۔ دیوتاؤں کے قدم بھی۔ شیطان کی ہنسی بھی
میں پھولوں کی مہک ، محبوب کا تبسم ، محنت کا سوز ، آبروریزی کا پہلا
آنسو۔ سدا بھٹکتا رہتا ہوں۔ ادھر سے ادھر ہر روز سینکڑوں ہاتھ گھیر کر مجھے
پکڑ لیتے ہیں۔ اور چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔ ایسا لگتا ہے جیسے پوری انسانی
تہذیب۔ لولی اور لنگڑی ہے اور کرنسی کی بیساکھیوں پر چل رہی ہے۔

کبھی کبھی مجھے اپنے آپ سے بڑا ڈر لگتا ہے کیونکہ وہ مجھ میں جھانکتے
ہیں اور اپنی زندگی کا مطلب کاغذ کے ایک پرزے سے دریافت کرنا چاہتے
ہیں۔ حالانکہ انہوں نے میرا اسائز مقرر کیا۔ میری قیمت مقرر کی۔ مجھ پر مہر
لگائی۔ اس پر ایک وعدہ نصب کیا۔ اور اسے ایک صلیب کی طرح سماج
کے گلے میں ٹانک دیا۔ اور گو میرا رنگ۔ روپ چہرہ مہرہ۔ ناک نقشہ۔ قد قیمت
سب مقرر ہیں۔ پھر بھی وہ مجھے دیکھتے ہی یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ وہ تمام
اصول جو بدائی، انجیل کے کڑے احکام کی طرح انہوں نے خود میرے ماتھے پر
لگوائے ہیں۔ اور تلاش کرتے ہیں اس زندگی کے ان تمام پسندوں کو کاغذ
کی ایک محدود تنگنائی ہیں۔ اپنی چھوٹی بڑی خواہشوں کے مطابق کبھی وہ
میری قیمت کو گھٹاتے رہتے ہیں۔ کبھی بڑھاتے رہتے ہیں۔ اور ایک
مذہبی کتاب کی طرح میرے متن میں سے اپنے مطلب کے معنے نکال لیتے

رہیں ہمراہ کوشاں رہتے ہیں۔
شاید یہی کاغذ کا ایک پُرزہ نہیں ہو۔
میں اس عہد کی سب سے بڑی مذہبی کتاب ہو!

# تمام شد

# کرشن چندر کی تصنیفات

| | | | |
|---|---|---|---|
| درد کی نہر | ۱-۷۵ | گھونگھٹ میں گوری جلے | ۲-۰۰ |
| شالو | ۳-۵۰ | زندگی کے موڑ پر | ۱-۵۰ |
| حبیبہ | ۲-۵۰ | غدار | ۱-۵۰ |
| پکنک | ۱-۷۵ | سڑک واپس جاتی ہے | ۴-۷۵ |
| اکسٹرا سے سپرویژن تک | ۲-۷۵ | اک وائلن سمندر کے کنارے | ۶-۰۰ |
| لندن کے سات رنگ | ۲-۰۰ | اک عورت ہزار دیوانے | ۵-۰۰ |
| ٹرگاؤں کی رانی | ۲-۰۰ | چاندی کا گھاؤ | ۹-۰۰ |
| پانچ لوفر | ۴-۰۰ | مینا بازار | ۳-۵۰ |
| سپنوں کا قیدی | ۳-۰۰ | دادر پل کے بچے | ۲-۵۰ |
| ٹوٹے ہوئے تارے | ۲-۵۰ | خوگوش کا سپنا | ۲-۰۰ |
| طلسم خیال۔ | ۲-۵۰ | ستاروں کی سیر | ۲-۲۵ |
| تین غنڈے | ۳-۰۰ | کرشن چندر کے بہترین افسانے مرتبہ اختر جعفری | ۲-۰۰ |